قیمت : -/10 روپے

جنوری 2008

ماہ نامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے چیئرمین عالی جناب ارجن سنگھ
کونسل کی میٹنگ منعقدہ 14 دسمبر 2007 کی صدارت فرماتے ہوئے۔ تصویر میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر علی جاوید بھی نظر آرہے ہیں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند

14 دسمبر 2007 کو فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر اور قومی اردو کونسل کے چیئرمین عالی جناب ارجن سنگھ کے زیر صدارت این سی. پی. یو. ایل. کی جنرل کونسل کی میٹنگ ہوئی جس میں اہم امور زیر غور آئے۔ تصویر میں (دائیں سے) وزیر محترم کے علاوہ این سی. پی. یو. ایل کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر قمر رئیس اور جناب اقبال مجید

جنرل کونسل کے محترم اراکین (بائیں سے) جناب شاہ نور الحق قادری، جناب جلیل پاشا (حیدرآباد)، جناب ممتاز راشد (ممبئی)، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر نعمان خاں

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔10، شمارہ۔1 جنوری 2008

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپئے، سالانہ -/100 روپئے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات ... قارئین کے خطوط ... 2
ہماری بات ... ادارہ ... 4
● اردو شاعری پر میر کے اثرات ... ڈی. پورن دیسوری ... 5

زبان، ادب اور تعلیم
● اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف ... شمس الرحمن فاروقی ... 7
● ڈاکٹر عبدالعلیم کی یاد میں ... رفعت سروش ... 9
● ہندی اور اردو کی مشترکہ وراثت ... کملیشور/محمد عطا حسین انصاری ... 11
● جدید افریقی شاعری ... صغیر اشرف ... 13

تہذیب اور ثقافت
● گواسکر کا بیان ... سید حامد ... 15
● موگھیا قبائلی رسم و رواج ... وقار صدیقی ... 18

صحت، سائنس اور ماحولیات
● آلودگی اور درپیش مسائل ... محمد خلیل ... 20
● سائنس کی ترقی اور مائیکرو چپس ... اقبال محی الدین ... 22
● سیارچے۔ خطرات اور امکانات ... عظیم اقبال ... 25

کیریئر
● اقلیتی طلبہ کی کوچنگ اسکیم ... عبدالعلیم قدوائی ... 28
● انگریزی میں مہارت ... محمد احتشام الحسن مجاہد ... 32

روبرو
● سلیم اختر سے بات چیت ... اسد فیض ... 34

ہماری مطبوعات سے
● توانائی کے غیر رسمی وسائل ... سید جعفر محمود ... 37
اردو خبرنامہ ... ادارہ ... 49
تبصرہ و تعارف ... کتابوں پر تبصرے ... 66

بچوں کا گوشہ
● نادان مرغا ... خسرو متین ... 74
● پہلی پرواز ... لیان او فلاہرٹی ... 76

آپ کی بات

■ راج بہادر گوڑ، ہاؤس نمبر 1-8-1/99، سوریا نگر، حیدرآباد-500020

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ بابت دسمبر 2007 ملا۔ بیماری کے باوجود بستر مرض پر ہی اسے پڑھنا شروع کیا۔ صفحہ 4 پر شمس الرحمٰن فاروقی کے وہ جواب شائع ہوئے ہیں جو قارئین کے سوالوں میں اٹھائے گئے ہیں۔ ان جوابوں میں پہلا ہی جواب کھٹکنے لگا۔ سوچا کچھ لکھ دوں اور اگر ہو سکے تو فاروقی صاحب اسے نظر انداز نہیں کریں گے اور میری تعلیم میں جو کمزوری آ گئی ہے وہ دور ہو سکے اور مسئلہ بھی علمی انداز میں سمجھ جائے۔

جہاں تک میں جانتا ہوں خواب، خواجہ، وغیرہ الفاظ میں ''و'' کا استعمال غیر ضروری نہیں ہے اور لفظ کے تلفظ میں ''و'' کی موجودگی سننے والے کو محسوس ہوتی ہے۔ اس کو لکھ کر نہیں بتایا جا سکتا، پڑھنے ہی میں اس تلفظ کو ادا کیا جا سکتا ہے۔ ''خواب''، اور ''جناب'' میں ''و'' نے جو فرق ڈالا ہے اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اس لیے میں سمجھتا ہوں اور مجھے یہی پڑھایا گیا ہے کہ یہ فرق ہے اور اس کا تحریر میں اشارہ ملنا چاہیے۔ امید کہ گستاخی معاف کی جائے گی۔

■ شمس الرحمٰن فاروقی، C-29، یونسکو روڈ، الہ آباد، یوپی

میں جناب راج بہادر گوڑ کا ممنون ہوں کہ باوجود پیرانہ سری اور باوجود خرابیِ صحت وہ میرا کالم نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ اس پر غور بھی فرماتے ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان کی اس محبت کا میں ہمیشہ شکر گذار ہوں گا۔

جہاں تک اس مسئلے کا سوال ہے جو جناب راج بہادر گوڑ نے اٹھایا ہے، تو اس سلسلے میں میری گذارش ہے کہ ''خواب''، ''خواجہ'' جیسے الفاظ میں واؤ کا لکھنا تو بہت ضروری ہے۔ اور میں نے یہ تاثر غالباً کہیں نہیں دیا ہے کہ ''ان الفاظ میں واؤ کا استعمال غیر ضروری'' ہے۔ میں تو یہی کہتا ہوں کہ املا جس طرح رائج ہو جائے وہی صحیح ہوتا ہے۔ رائج املا ایسی چیز نہیں جس سے کوئی چھیڑ چھاڑ کی جائے، خواہ ''اصلاح'' کے طور پر خواہ تلفظ کی روشنی میں۔

اب رہی بات کہ لفظ ''خواب''، ''خواجہ''، ''خوان'' وغیرہ میں جو واؤ ہے وہ تھوڑی بہت سننے میں آتی ہے اور وہ معدوم نہیں ہے، تو بے شک بہت سے لوگوں کے تلفظ میں ''خواب'' وغیرہ الفاظ میں واؤ کی جھلک سنائی دیتی ہے۔ میں اسے علاقائی فرق سمجھتا ہوں اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اصولی اعتبار سے ''خواب''، ''درخواست''، ''خوان''، ''خوانچہ''، ''خود''، ''خوش'' وغیرہ الفاظ میں واؤ کا وجود نہیں ہے۔ لیکن جناب راج بہادر گوڑ کا اشارہ غالباً صرف ان الفاظ کی طرف ہے جن میں واؤ کے بعد الف آتا ہے جیسے ''خواب''، ''خوان''، ''خواجہ'' وغیرہ۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ لفظ ''خواب'' کے سامنے لفظ ''جناب'' رکھا جائے تو ''خواب'' اور ''جناب'' میں واؤ نے جو فرق ڈالا ہے اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہاں میں یہ کہوں گا کہ جناب راج بہادر گوڑ اس بات پر غور کریں کہ اگر ''خواب'' میں واؤ کے تلفظ کا کوئی مقام ہوتا تو اس میں ''خ'' کو ''جناب'' کی ''ج''، یا ''رقاب'' کی ''ر''، یا ''کتاب'' کے ''ک'' کی طرح الگ پڑھا اور ظاہر کیا جاتا۔ ملاحظہ فرمائیں کہ ''جناب''، ''کتاب''، ''رقاب'' وغیرہ الفاظ میں ''ج''، ''ر'' اور ''ک'' پورے پورے ادا ہوتے ہیں اور ان پر ایک ایک حرکت ہے۔ ان کے بعد کا حرف بھی متحرک ہے۔ یعنی ''جناب'' میں جیم پر زبر، اور اس کے بعد نون پر بھی زبر ہے اور الف ساکن ہے۔ اسی طرح، ''رقاب'' میں رے پر زبر ہے اور قاف پر زبر ہے اور الف ساکن ہے۔ اسی طرح، ''کتاب'' میں کاف پر زیر ہے، تے پر زبر اور الف ساکن ہے۔ لیکن اس کے برخلاف ''خواب'' میں خے پر زبر کے بعد حرف الف ساکن ہے اور اس پر کوئی بھی حرکت نہیں۔ املا سکھاتے وقت اسے یوں ظاہر کرتے ہیں: ''خ واؤ الف زبر = خا''۔ اس سے صاف ظاہر ہوا کہ ''خواب'' میں ''واؤ'' کی مکتوبی حیثیت تو کچھ ہے لیکن اس کی ملفوظی حیثیت کچھ نہیں ہے، کیوں کہ ''واؤ'' کے بعد کوئی متحرک حرف نہیں، صرف الف ساکن ہے۔ تقطیع کے اعتبار سے بھی ''خواب'' کے خ واؤ کو ایک ہی حرف مانا جاتا ہے۔ یعنی ''خواب'' کا وزن وہی ہے جو ''باب'' کا ہے۔ اگر ''خواب'' کو ''جناب'' کے وزن پر موزوں کیا جائے تو شعر غلط ٹھہرے گا۔

امید ہے کہ ان معروضات سے جناب راج بہادر گوڑ اور دوسرے قارئین کی تشفی ہو گئی ہوگی۔

■ عبدالرافع، 44 تا پتی ہاسٹل، سے این یو، نئی دہلی-110067

دسمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ بلا تاخیر ابتدا تا آخر پڑھ ڈالا۔ رسالہ صوری و معنوی اعتبار سے قابل توجہ ہے۔ اس کے بیشتر موضوعات مثلاً زبان و تعلیم، ادب و صحافت، صحت، ماحول اور سائنس، روبرو اور کیریئر اس کی قدر و قیمت میں اضافے کے باعث ہیں۔ مزید نئی مطبوعات، اردو خبریں اور بچوں کا گوشہ بھی کم اہمیت کے حامل نہیں۔ ادارہ اس اہم رسالے کے ذریعے قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

آپ کی ادارت نے اس رسالے کو معیار اور وقار بخشا ہے۔ آپ کا اداریہ ہر ماہ نت نئے رنگ و آہنگ میں ڈوبا ہوتا ہے۔ اس ماہ بھی چونکا دینے والا ہے۔ جس طرح آپ نے اخبارات میں استعمال ہونے والی زبان پہ علاقائی اثرات کی طرف توجہ دلائی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ یقیناً اس سے اردو کی چاشنی، حلاوت اور نفاست معدوم ہو جائے گی۔ اس جانب ایک مؤثر قدم اٹھانے کی سخت ضرورت ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا کالم ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' ہم جیسے کم علم اور تشنہ طلب پر ان کا احسان و اکرام ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ ہر ماہ چند سوالات و جوابات کے اضافے ہو جاتے۔ عزیز احمد کا مضمون وقیع ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اردو کی ترویج و ترقی ہو تو اس عظیم لسانی اور ثقافتی ورثے کا ہر ایک شخص کو امین اور محافظ بننا ہوگا اور اس کے لیے عملی قدم اٹھانے ہوں گے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے صحیح معنوں میں اسے اپنانے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ انیس چشتی نے بھی جس طرح جدید تحقیقات کی روشنی میں اردو تدریس کے طریقۂ کار کی جانب توجہ دلائی ہے بہت خوب ہے۔ ریاض احمد کا مضمون بھی خاصا معلوماتی ہے۔

منظر کاظمی کی شخصیت کے چند روشن پہلو اور ان کے افسانوں کے مختلف جہات کے تعلق سے فاروقی صاحب کا وقیع مضمون بھی دلچسپی سے پڑھا۔ بشریٰ اعجاز نے قرۃ العین حیدر کے متعلق جس طرح روحانی کیفیت میں ڈوب کر اپنے احساسات و جذبات کی عکاسی کی ہے ان کی ادب دوستی اور ادیبہ سے دلی لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد کے ہی صفحے پر نکہت پروین کا نثری حسن و نزاکت سے بھرپور ''رپورتاژ'' لطف کو دوبالا کر گیا۔ میں بھی خود کو کچھ دیر کے لیے منی پوری رنگ برنگی ادبی و ثقافتی انجمن میں شریک پایا۔ اقبال مجید سے وسیم اختر کی بات چیت ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں اور افسانوی رجحانات کے مختصر مگر اہم نکات کی طرف اشارہ ہے۔ شوبھا دویدی نے سچا سمرم پروجیکٹ کے تعلق سے مثبت اور منفی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ کیریئر گائیڈ سے وابستہ دونوں مضامین معلوماتی ہیں۔

دل کے نہاں خانوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں ڈاکٹر ابوبکر عباد کو کہ انھوں نے بحیثیت پرنسپل پبلی کیشن آفیسر کا عہدہ سنبھالا ہے۔ یہ ادارے کے لیے نیک شگون ہے۔ امید قوی ہے کہ اس سنجیدہ اور فعال شخصیت سے ادارے کو تقویت ملے گی۔

بہت ہی افسوس ناک خبر ہے کہ محترمہ جمیلہ فاروقی اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے، یہ یقیناً اردو دنیا کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ خدا فاروقی صاحب کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

■ **عبدالرب، موضع ریواں، پوسٹ ملہوار، ضلع سدھارتھ نگر، یوپی**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ بابت دسمبر 2007 باصرہ نواز ہوا۔ میں پوری دلچسپی اور شوق سے اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اگر ایک طرف رسالے کے مشمولات خصوصی توجہ کے متقاضی ہوتے ہیں تو اس کی صاف ستھری طباعت اور جاذب نظر سرورق بھی اسے منفرد بناتے ہیں۔ آپ نے اداریے میں اخبارات میں استعمال کی جانے والی زبان کی جانب بروقت توجہ دلائی ہے۔ یہ مسئلہ یقیناً قابل غور ہے۔ اس شمارے میں زبان و تعلیم کے تحت شامل تمام مضامین بہت اہم ہیں۔ عزیز احمد نے اپنے مضمون میں نہایت اہم تجاویز پیش کی ہیں۔ اکادمیوں اور اردو مراکز کا سہارا لیے بغیر بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے اگر اردو کے تمام بہی خواہ ذاتی طور پر دلچسپی لیں اور اپنا احتساب کرتے رہیں تو بہت بہتر نتیجے سامنے آئیں گے۔ دیگر مضامین میں ف۔س۔ اعجاز کا مضمون بہت اہم ہے۔ طالب علموں کے لیے خاص طور پر یہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ بشریٰ اعجاز کی تحریر بہت متاثر کن ہے۔ نکہت پروین نے ''رپورتاژ'' میں سیمینار کی بہت دلچسپ تصویر پیش کی ہے۔ اقبال مجید سے بات چیت بھی خوب ہے۔ ان کے فن پر مزید گفتگو کی ضرورت تھی۔ تبصروں میں جاوید رحمانی، شعیب رضا، احمد کفیل، ابوبکر عباد اور نجمہ رحمانی کے تبصرے ایسے ہیں جو اس گوشے کو بھی دیگر رسائل سے ممتاز کرتے ہیں۔

اردو کونسل میں پرنسپل پبلی کیشن آفیسر کے عہدے پر ڈاکٹر ابوبکر عباد کا تقرر، امید ہے اردو کے لیے فال نیک ثابت ہوگا۔ کمیٹی اس حسن انتخاب کے لیے لائق مبارکباد ہے۔

■ **حمید اللہ قاسمی کیرنگری، مدیر معاون ماہ نامہ ''نقوش اسلام''، مظفر آباد، سہارنپور (یوپی)**

گلستان علم و ادب کے رنگارنگ، اچھوتے پھولوں کا تروتازہ اور شاداب گلدستہ ''اردو دنیا'' نظر نواز ہوا۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا کالم ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' بہت معلومات افزا ہے۔ ایسے مضامین اردو کی ترویج و ترقی کے ضامن ہوتے ہیں۔ اداریے میں آپ نے جو یہ بات کہی ہے کہ ''دلی کو ملک کی ہی نہیں بلکہ اردو کی بھی راجدھانی کہا جاتا ہے'' تو یہ بجا اور درست ہے، کیونکہ اردو زبان کی ابتدائی پرورش و پرداخت اسی شہر کی مرہون منت ہے۔

سب سے زیادہ خوشی و مسرت کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ابوبکر عباد نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی میں پرنسپل پبلی کیشن آفیسر کا عہدہ سنبھال لیا ہے، ان کے والد محترم احقر کے استاد مکرم اور دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم ادارے کے مفتی اعظم ہیں۔

□□□

ہماری بات

مشاعرہ ایک اہم تہذیبی اور ثقافتی مظہر ہے اور اس کے آغاز سے آج تک اس کی مقبولیت برقرار ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو زبان کو جن سخت حالات سے گزرنا پڑا ان کے اثرات کو کم کرنے میں بھی مشاعروں کا اہم کردار رہا ہے۔ آج بھی مشاعرے عوام تک رسائی کا اہم وسیلہ ہیں۔ وہ لوگ بھی جو اردو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے مشاعروں میں ذوق و شوق سے شریک ہوتے ہیں اور مشاعرے کے اختتام پر جب اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں تو ان کے ذخیرۂ الفاظ میں اردو کے ایسے کئی لفظ شامل ہو چکے ہوتے ہیں جن سے وہ اب تک ناآشنا تھے۔ ہمارا ذاتی مشاہدہ ہے کہ بہت سے غیر اردو داں حضرات میں مشاعروں میں پڑھے جانے والے کلام سے متاثر ہو کر اردو پڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی اور انھوں نے اس خواہش کو عملی شکل بھی دی۔

بعض دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر جن کی افادیت مسلم ہے، حالات موجودہ مشاعروں کا یہ پہلو بھی اتنا اہم ہے کہ اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اردو کی یہ بڑی خوبی ہے کہ یہ کسی مخصوص مذہب و مسلک کی ترجمان نہیں، مختلف العقیدہ لوگوں نے اسے اپنے تجربات و مشاہدات اور جذبات و احساسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ اردو کا یہ سیکولر کردار مشاعروں میں بھی نظر آتا رہا ہے اور اسے قائم رہنا چاہیے۔ مشاعروں میں مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر اب ہزاروں سامعین شرکت کرنے لگے ہیں۔ ان میں اچھی شاعری کے رسیا بھی ہوتے ہیں اور وہ بھی جو سستی تفریح کی طلب میں مشاعرہ گاہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ تفریح دو طریقوں سے فراہم کی جانے لگی ہے۔ ملک میں گاہ بہ گاہ جو فرقہ وارانہ مناقشے سر اٹھاتے رہتے ہیں، ان کا اس انداز میں حوالہ دے کر کہ سارا قصور ایک فریق کے سر منڈھ دیا جائے اور دوسرے فریق کو کلیتہً بے قصور ٹھہرایا جائے یا پھر ایسی شاعری سنائی جائے جسے میر نے چوما چاٹی کی شاعری کا نام دیا تھا۔ مشاعرہ دراصل اب ایک منفعت بخش کاروبار بھی بن گیا ہے جسے بہت سے شاعروں اور مشاعرے برپا کرنے والوں نے اسی حیثیت میں قبول بھی کر لیا ہے۔ ہنگامی مقبولیت اور شہرت حاصل کرنے کے لیے نفرت انگیز یا صنفی جذبات کو برانگیختہ کرنے والا کلام مشاعروں میں سنانا شاعر کے منصب کے بھی منافی ہے اور مشاعرے کی تہذیب کے بھی۔ عصری موضوعات و مسائل کا اظہار شاعری میں ضرور ہو لیکن انسانی نقطۂ نظر سے، دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ۔ معاملاتِ حسن و عشق بھی شاعری کے لیے شجرِ ممنوعہ نہیں بلکہ یہی معاملات ہیں جو کلام میں زور و اثر پیدا کرتے ہیں لیکن ان کے اظہار میں بھی سلیقہ شرط ہے، بھونڈے انداز میں ان معاملات کو بیان کیا جائے تو نفیس طبیعتوں میں یہ اہتزاز کی بجائے اکراہ پیدا کرتے ہیں۔

ایک بدعتِ قبیحہ مشاعروں میں ان شاعرات کی آمد ہے جنھیں شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور جو ایک مصرعہ موزوں کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہیں۔ یہ دوسروں کے کہے ہوئے شعر عام طور پر دیوناگری لپی میں لکھ کر لاتی ہیں اور انھیں ترنم سے نہیں بلکہ گائیکی کے انداز میں پیش کرتی ہیں، بیچ بیچ میں سامعین سے ایک ادائے دلربائی کے ساتھ مکالمہ بھی کرتی ہیں۔ ملک میں سنجیدہ شاعرات کی کمی نہیں جن کی شاعری عصری شعری منظرنامے میں ایک حرفِ جلی کی طرح روشن ہے۔ مگر وہ مشاعروں میں کبھی کبھار ہی نظر آتی ہیں۔

نقیب مشاعرہ بھی جو آزادی کے بعد مشاعروں میں نمودار ہوئے ہیں، کبھی کبھی مشاعرے کی فضا بگاڑ دیتے ہیں۔ ایک نقیب مشاعرہ تھے، خدا ان کی مغفرت فرمائے، انھیں دورانِ مشاعرہ لطیفے سنانے کا بہت شوق تھا اور لطیفے انھیں بالعموم اس وقت یاد آتے تھے جب شاعر کلام پڑھ رہا ہو، اُدھر شاعر کے سامنے جو مائک ہے اس پر وہ کلام پڑھ رہا ہے، اِدھر انھوں نے اپنے سامنے رکھے ہوئے مائک سے لطیفہ ہال میں اچھال دیا۔ ایک نقیب مشاعرہ ہیں، خدا انھیں سلامت رکھے، وہ شاعر کے تعارف میں اتنا وقت صرف کر دیتے ہیں جتنا وقت شاعر کلام سنانے میں نہیں لیتا۔ کچھ نقیب مشاعرہ ایسے ضرور ہیں جو موقع و محل کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور حسبِ ضرورت ہی بولتے ہیں۔

ایک مسئلہ صدر مشاعرہ اور مہمانانِ خصوصی کا بھی ہے۔ اس صف میں بالعموم وہ لوگ نظر آنے لگے ہیں جو یا تو کسی سیاسی منصب پر فائز ہیں یا کسی بڑے کاروباری ادارے کے سربراہ ہیں۔ یہ لوگ مشاعرے میں اسی وقت تک رہتے ہیں جب تک انھیں ہار پھول پیش کیے جاتے رہیں یا ان کی تعریف و توصیف بیان ہوتی رہے۔ پھر یہ اپنی دوسری مصروفیتوں کا عذر کر کے مشاعرہ گاہ سے رخصت ہو جاتے ہیں اور ان کے ساتھ ان کے حواری بھی۔ اس سے ماحول میں جو افراتفری پیدا ہوتی ہے وہ مشاعرے کے آخر تک اپنا اثر دکھاتی ہے۔

یہ سطور لکھنے کی تحریک اس سیمینار سے ہوئی جو پچھلے دنوں دلی اردو اکادمی نے ''مشاعرے کی روایت: کمال و زوال'' کے عنوان سے کیا تھا۔ یہ ایک اچھا قدم تھا۔ مشاعرے کی کشش آج بھی باقی ہے اور خواص ہوں کہ عوام مشاعروں میں ذوق و شوق سے شریک ہوتے ہیں۔ مشاعرے کے تہذیبی اور ثقافتی وقار کو کس طرح قائم رکھا جائے اور ان منفی عوامل کی روک تھام کیسے کی جائے جو اس قدیم روایتی ادارے کو زوال کی طرف لے جا رہے ہیں، اس پر غور کرنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں اردو اکادمیاں پہل کر سکتی ہیں، جن کے مشاعروں سے نہ تو مالی مفادات وابستہ ہیں نہ انھیں حکام رسی کی ضرورت لاحق ہے۔ انھیں بس اتنی جرأت دکھانی ہے کہ شعرا کے انتخاب میں سیاسی یا حکومتی مداخلت قبول نہ کریں اور صرف اپنی صوابدید کو بروئے کار لائیں۔

□□□

ڈی. پورن دیسوری

اردو شاعری پر میر کے اثرات

● مندرجہ بالا موضوع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی طرف سے منی پور کی راجدھانی امپھال میں جو سیمینار منعقد ہوا تھا، اس کی روداد ''اردو دنیا'' کے گذشتہ شمارے میں قارئین ملاحظہ کرچکے ہیں۔ ذیل میں وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند کی وزیر مملکت اور سیمینار کے افتتاحی اجلاس کی مہمانِ خصوصی محترمہ ڈی. پورن دیسوری کی اس انگریزی تقریر کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے جو انھوں نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کی تھی اور بہت پسند کی گئی تھی۔

(ادارہ)

یہ میرے لیے انتہائی مسرت کی بات ہے کہ اردو کے شہرۂ آفاق شاعر میر تقی میر کی شاعرانہ جہات پر جس قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا ہے، میں اس کی افتتاحیہ تقریب میں موجود ہوں۔

یہ خیال غلط ہے کہ ہندوستان میں اردو کسی خاص طبقے، کسی خاص مذہب یا کسی خاص علاقے کی زبان ہے۔ ہندوستانی زبان کے طور پر اردو زبان کی قدر و قیمت تسلیم شدہ ہے اور اسے یہاں دستوری تحفظ حاصل ہے۔ دستور ہند کے آٹھویں جدول میں اردو ہندوستانی زبان کے طور پر شامل ہے۔ اس زبان کو ملک کی کئی ریاستوں میں سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ ملک کی ان ریاستوں میں آندھرا پردیش، بہار، دہلی، جموں و کشمیر، اور اتر پردیش جیسی ریاستیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ہمارے ملک میں اردو زبان اتر پردیش، دہلی، بھوپال، حیدرآباد، بنگلور اور میسور وغیرہ کے اکثر علاقوں میں رابطے کی زبان ہے اور یہ کثرت بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان کے بعض اسکولوں میں یہ زبان پہلی زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ ان اسکولوں کا اپنا نصاب ہے اور امتحان کا اپنا نظام ہے۔ ہندوستان کے مدارس میں بھی عربی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں 2,900 سے زیادہ اردو اخبارات (روزنامے) شائع ہوتے ہیں۔ ان میں روزنامہ سالار، روزنامہ پاسبان، روزنامہ سیاست، روزنامہ منصف، اور روزنامہ انقلاب/ بنگلور، میسور، حیدرآباد اور ممبئی سے شائع ہوتے ہیں۔

اردو زبان کے سماجی منظرنامے پر طائرانہ نگاہ بھی ڈالیں تو اس حقیقت کا اندازہ ہوجائے گا کہ یہ زبان ان لوگوں کے درمیان ہی مقبول نہیں جو معاشی اور سماجی اعتبار سے مستحکم حیثیت رکھتے ہیں بلکہ یہ ان لوگوں کے درمیان بھی رائج ہے جو ابھی یہاں تک نہیں پہنچے ہیں۔ ملکی آبادی کی اکثریت یہ زبان بولتی ہے۔ یہ صورتحال کم وبیش ملک کی تمام ریاستوں میں ہے کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان ہمارے سماجی اور تہذیبی ورثے کی محافظ ہے۔

اردو زبان کو خصوصی طور پر اس کے شعر و ادب کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے، خصوصاً غزل کی وجہ سے۔ مگر یہ جزوی صداقت ہے۔ اردو زبان نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ بیرون ملک کے متعدد اداروں اور یونیورسٹیوں میں مختلف النوع مضامین کے لیے ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ ہم لوگوں کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اس زبان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے اور اس کی ترقی کی راہ میں منفی عوامل حائل نہ ہوں۔ اردو زبان کسی مخصوص حصۂ آبادی میں محدود ہوکر نہ رہے، اس کے لیے حکومت نے بھی پیش رفت کی ہے۔ 1998 میں حیدرآباد میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا، اس کا اولین مقصد ملک گیر پیمانے پر اس زبان کو فروغ دینا ہے۔ اس یونیورسٹی میں نئے علوم بالخصوص اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے اردو میں مواد مہیا کیا گیا ہے، اس کے علاوہ تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ اردو زبان کی قومی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہماری حکومت، یونیورسٹی کے تمام نئے منصوبوں اور پروگراموں کا خیر مقدم کرتی ہے۔ اردو عوام کی زبان ہے، یہ تخیل اور جذبات سے مالا مال ایسی زبان ہے جو پورے ملک میں قومی، ثقافتی اور تہذیبی سطح پر ایک پُل بناتی ہے۔ اردو، ڈراما، سنیما، شاعری، سیاست اور روزمرّہ کی زندگی میں بول چال کی زبان ہے۔ یہ زبان تمام غیر فطری اور مصنوعی فاصلوں یعنی ذات، نسل اور مذہب کے امتیاز کو لغو گردانتی ہے— اس لیے وقتاً فوقتاً دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے مشہور شاعروں کی حیات و خدمات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے، چونکہ ان شاعروں نے ہمارے سماجی اور قومی منظرنامے کو متمول بنایا ہے۔ اردو زبان کے سربرآوردہ شاعر میر تقی میر کی بے پناہ شاعرانہ قوت پر روشنی ڈالنے اور ان کے شاعرانہ اوصاف کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نے ان کی یاد میں اس سیمینار کا انعقاد اس لیے کیا ہے کہ میر نے ہمارے سماجی اور قومی منظرنامے کو بہت کچھ

دیا ہے۔ وہ عظیم شاعر تھے، ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بھی نے کیا ہے۔ وہ غزل کی دنیا میں ایک آدرش ہیں، لیکن ان کی بے پناہ شاعرانہ قوت اور جوہر کا اظہار شاعری کی دیگر اصناف میں بھی کھل کر ہوا ہے۔ 18ویں صدی کے اس غیرمعمولی شاعر کی شاعرانہ عظمت کو نہ ان کے زمانے کا کوئی شاعر و ادیب چیلنج کر سکا اور نہ ہی موجودہ زمانے کا کوئی شاعر و ادیب۔

غزل کی شاعری اصل میں عشق کی شاعری ہے یعنی عشق غزل کی روح ہے۔ اردو شاعری میں عشق کی معنویت محدود نہیں۔ اردو غزل میں عشق کی جو معنویت ہے وہ ان تمام امتیازات کی نفی کرتی ہے جن کی بنیاد ذات، نسل اور مذہب کی تفریق پر ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو غزل کے مطالعے سے ذہن و دل میں ایک مثبت سوچ کی لہریں پیدا ہوتی ہیں اور دیرپا اثر قائم کرتی ہیں۔

میر کی عظمت ان کی غزلوں کی مرہون منت ہے۔ میر اس زمانے میں تھے جب اردو زبان اور شاعری تشکیلی مرحلے میں تھی۔ میر کی جمالیات امتزاجی ہے۔ انھوں نے مقامی عناصر کو ان اثرات سے ہم آہنگ کیا جو فارسی کی دین تھے اور ان دونوں کے امتزاج سے ایک ایسے پیرایۂ اظہار کی تشکیل میں حصہ لیا جس کو ان کے زمانے میں ریختہ کہا گیا۔ اس زبان کے خمیر میں اعلیٰ انسانی اقدار سے گہرا لگاؤ شامل ہے۔ میر کی سادہ اور سلیس زبان ان کے بعد آنے والے شاعروں کے لیے رہنما ثابت ہوئی۔

میر تقی میر کا غالب سے تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری کے دلدادہ کبھی میر کی عظمت پر زور دیتے ہیں تو کبھی غالب کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ خود غالب نے اپنے بعض اشعار میں میر کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ غالب کا مشہور مقطع ہے جس میں انھوں نے میر کی استادی کو ان لفظوں میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

ریختہ کے تمھی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

میر کی شاعری ہمارا قومی ورثہ ہے، یہ ہماری مشترک وراثت ہے اس لیے اس کی بقا، تحفظ اور اس روایت کے فروغ کی ذمے داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے۔ یہ ایسی ذمے داری ہے جس کو ہمیں دل کی گہرائی اور خوشی سے قبول کرنا چاہیے۔ میر کی شاعری میں انسانیت اور محبت کا پیغام عالمی تناظر میں ملتا ہے۔ ان کے فلسفۂ انسانیت کو معمولی لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میر کی شاعری ہمارے احساسات اور تخیلات کا جس طرح احاطہ کرتی ہے، اور ہمارے ذہن و دل کو جس قوت کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیتی ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ ان کا پیغام ہمارے ذہن و دل کو سرشار کرتا ہے، کہ ان کی آواز میں پوری انسانیت کی آواز شامل ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ اس سیمینار سے میر کی عظمت اور معنویت کے نئے نئے گوشے روشن ہوں گے، اور ان کی شاعری کے وسیلے سے انسانی قدروں کو نئے تناظر میں دیکھا جائے گا۔ میں مبارکباد دینا چاہتی ہوں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو، اس اچھے کام کے لیے، اور میری نیک خواہشات اس کے ذمے داران کے ساتھ ہیں۔ کونسل کی طرف سے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے جو نمایاں کام انجام دیے جا رہے ہیں مجھے یقین ہے کہ کونسل انھیں مستقبل میں بھی جاری رکھے گی۔

□□□

مترجم — فیاض احمد وجیہہ

ڈیوڈ کاپرفیلڈ (جلد اوّل)

مصنف: چارلس ڈکنس / مترجم: فضلِ حسنین

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشاپردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔
اسے ترجمہ نہیں، اصل ناول کا عکسِ جمیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔
ڈیڑھ سو برس قبل انگریزی میں لکھے گئے اس شہرۂ آفاق ناول کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ پیش کرنے کا شرف ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کو حاصل ہے۔
صفحات: 516، قیمت: -/256 روپئے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔ اداره
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

سوال: ''جزو لاینفک'' لفظ کیسے بنا اور اس کے اصل معنی کیا ہیں؟ اس کا استعمال بھی بتانے کی زحمت کریں۔

جواب: یہ عربی فقرہ ہے۔ اس کے معنی ہیں ''وہ حصہ، یا وہ جزو جو الگ نہ ہو سکے۔'' یعنی کسی شے کا وہ عنصر جسے الگ کریں تو اس شے کا وجود خطرے میں پڑ جائے، یا ختم ہی ہو جائے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں: ''لا الٰہ الا اللہ اذان کا جزو لاینفک ہے۔'' یعنی لا الٰہ الا اللہ نہ کہیں تو اذان قائم ہی نہ ہوگی۔ یا ہم کہتے ہیں: ''لڑکی کی منظوری نکاح کا جزو لاینفک ہے۔'' یعنی جس لڑکی کا نکاح پڑھانا مقصود ہے، اگر وہ منظوری نہ دے تو نکاح منعقد ہی نہ ہوگا۔ یا ہم کہتے ہیں: ''شربت کے لیے مٹھاس جزو لاینفک ہے۔'' یعنی کوئی چیز پینے کے لیے بنائی گئی اور اس میں شکر یا مٹھاس نہ ہو تو وہ چیز شربت نہ کہلائے گی۔

عربی لفظ ''جُزو'' (اول مضموم، سوم موقوف) کے معنی ہیں، ''ٹکڑا، حصہ''۔ ان معنی میں یہ لفظ ''کُل'' (اول مضموم) کی ضد ہے۔ ''لا'' کے معنی معلوم ہی ہیں، ''نہیں''، اور ''یَنفَک'' (اول اور سوم مفتوح) کے معنی ہیں، ''وہ الگ نہیں ہوتا۔'' اس کا مادّہ ''ف ک ک'' ہے، بمعنی ''دو چیزیں جو آپس میں ملی ہوئی ہوں ان کو الگ کرنا؛ کسی کو آزاد کرنا''، وغیرہ۔ اس کو باب انفعال میں لے جاتے ہیں تو ''انفکاک'' حاصل ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہیں ''ایک دوسرے سے الگ ہونا، آزاد ہونا۔'' صیغۂ حال واحد غائب ''ینفَک'' اسی سے بنا ہے۔ ملحوظ رہے کہ اردو میں ''جزو'' اور ''جز'' دونوں صحیح ہیں لیکن جب ''لاینفک'' کے ساتھ لکھیں یا بولیں تو ''جزو'' ہی لکھا یا بولا جائے گا۔

(سوال از محمد کاظم، جوگیشوری، ممبئی-102)

سوال: ایک لفظ ہے ''تنہا''، جو عام طور پر ''اکیلا'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، تو کیا یہ لفظ مرکب ہے؟ اور اگر مرکب ہے تو کیا یہاں ''تن'' بمعنی ''جسم'' کے ہے؟ اردو میں ''ہا'' جمع کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً ''بارہا/ ہزار ہا/ صدہا'' وغیرہ۔ تو پھر ''تنہا'' میں اس ''ہا'' کا استعمال کیا صحیح ہے اور یہ لفظ کیسے بنا؟

جواب: فارسی لفظ ''تنہا'' بمعنی ''اکیلا'' میں ''ہا'' اصلی ہے، یعنی ''تن'' بمعنی ''جسم'' کا لاحقہ نہیں ہے۔ ''تن ہا/صدہا/بارہا/درخت ہا'' وغیرہ میں ''ہا'' علامت جمع ہے۔ ''تنہا'' بمعنی ''اکیلا'' کی اصل نہیں معلوم، سوا اس کے کہ یہ فارسی کے پرانے لفظوں میں ہے۔ فارسی میں چونکہ ''یہ تنہا'' بھی اسی معنی میں بولتے ہیں اور ''ہا'' کے ایک معنی ''ایک'' یعنی ''ایں = یہ'' کا مخفف، ''برہان قاطع'' میں درج ہیں، لہٰذا ممکن ہے کہ یہاں ''ہا'' بمعنی ''یہ'' ہو، یعنی ''یہ جسم، صرف یہ جسم'' اور اس طرح ''اکیلا، منفرد'' وغیرہ معنی نکلے ہوں۔ لیکن یہ صرف قیاس ہے، اس پر کوئی دلیل نہیں۔

(سوال از فرزانہ انصاری، ملاڈ، ممبئی-95)

سوال: ''علی الرغم'' اور ''مستزاد'' کا مفہوم کیا ہے؟ انھیں استعمال کس طرح کیا جائے؟

جواب: ''علی الرغم'' میں اول، دوم اور ششم مفتوح ہیں۔ ششم پر تشدید ہے اور الف لام نہیں پڑھا جاتا۔ لہٰذا اس کو ''علَر رَغم'' پڑھتے بولتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں ''بر خلاف۔'' اور اس کا استعمال وہاں کرتے ہیں جہاں کسی کی خواہش یا تمنا کے برخلاف کوئی کام ہو۔ مثلاً ہم کہتے ہیں: ''باپ تو بہت چاہتا تھا کہ بیٹا انجینئر بنے لیکن باپ کے علی الرغم بیٹے نے شاعر بننے کو ترجیح دی۔'' یا مثلاً غالب

علی الرغم دشمن شہید وفا ہوں
مبارک مبارک سلامت سلامت

یعنی دشمن تو چاہتا تھا کہ مجھے شہید وفا ہونے کی سعادت نصیب نہ ہو، لیکن میں نے شہید وفا بن کر دکھا دیا۔

''مستزاد'' میں اول مضموم اور سوم مفتوح ہے۔ اس کے معنی ہیں ''زیادہ کیا ہوا۔'' عربی مادہ ''زید/زاد'' بمعنی ''بڑھنا، بڑھانا'' کو باب افتعال میں لے جائیں تو ''استزاد'' حاصل ہوتا ہے، بمعنی ''زیادہ چاہنا، زیادہ طلب کرنا۔'' اس کا اسم مفعول ''مستزاد'' ہے، بمعنی ''زیادہ چاہا ہوا۔'' اردو میں یہ ''زیادہ کیا ہوا، اصل سے کچھ زیادہ، مزید'' کے معنی میں مستعمل ہے۔ مثلاً: ''انھوں نے سب کو رومال تو بانٹے ہی، رومالوں پر عطر لگا کر دیا، یہ لطف مستزاد تھا۔'' یا ''آپ نے میری ایک

بات کا تو جواب دیا، لیکن میں نے اس خط میں جو مستزاد عرض کیا تھا اس پر توجہ نہ کی۔'' یا، ''سردی تو خوب تھی ہی، تیز ہوا اس پر مستزاد۔'' اس لفظ کو طنزیہ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں، اردو فارسی شعر میں ایک ہیئت ''مستزاد'' کہلاتی ہے۔ اس میں نظم کے ہر مصرعے، یا غزل وغیرہ کے شعر میں ہر مصرعے، یا دوسرے مصرعے پر کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ اس کی خوبی اس میں ہے کہ مستزاد فقرہ معنی میں اضافہ تو کرتا ہے، لیکن اگر وہ نہ ہو تو کلام ناقص نہیں ہوتا۔ مولانا روم سے منسوب ایک مستزاد کے دو مصرعے ہیں:

ہر لحظہ بہ شکلے بتِ عیار برآمد　　دل بُرد و نہاں شد
ہر دم بہ لباسِ دگر آں یار برآمد　　گہ پیر و جواں شد

اس کے اتباع میں ہمارے شاہ نیاز صاحب بریلوی (۱۷۵۹ تا ۱۸۳۴) نے بھی خوب فرمایا ہے:

سرِّ خفی از مطلعِ انوار بر آمد　　نادیدہ عیاں شد
از بہرِ ظہورش پئے اظہار برآمد　　بر خود نگراں شد

اردو میں خواجہ میر درد کی رباعی مستزاد ہے:

اے درد شب قدر ہے ہر زلف رسا　　گر دل سے ہے راہ
ہر خط میں لکھی ہوئی ہیں آیات خدا　　کر نگ تو نگاہ
جوں آئینہ حیران ہوں میں سر تا پا　　ہے عشق گواہ
آتا ہے نظر حسن میں جلوہ کیا کیا　　اللہ اللہ

سوال: لفظ ''علامہ'' کا مفہوم واضح کریں۔ اس لفظ کے استعمال میں کیا احتیاط ضروری ہے؟ اس کا انگریزی متبادل کیا ہے؟

جواب: لفظ ''عالم'' کے مبالغے کا صیغہ لفظ ''علام'' ہے۔ یعنی بہت زیادہ عالم۔ جیسے ''فیض'' سے ''فیاض''، ''عیش'' سے ''عیاش'' وغیرہ۔ ''علام'' اور ''علامہ'' میں معنی کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، ''علامہ'' میں چھوٹی ہ (جسے عربی میں تاے وحدت کہیں گے) مزید علیہ ہے اور معنی میں اضافہ نہیں کرتی۔ بعض کا کہنا ہے کہ ''علام'' چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اس لیے انسان پر اس کا اطلاق درست نہیں، لہٰذا کسی بہت عالم انسان کو ''علام'' کی جگہ ''علامہ'' کہا جانا چاہیے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''علامہ'' کی تاے وحدت پر تاے تانیث کا دھوکا ہوتا ہے، اس لیے ''علامہ'' کہیں نہ ''علام'' کہیں، بلکہ ''علامی'' کہیں۔ یہ سب فضول کی موشگافیاں ہیں۔ عربی میں لفظ ''علامہ'' موجود ہے، بمعنی ''بہت عالم شخص'' اور وہیں سے یہ اردو اور فارسی میں آیا ہے اور اردو میں ہر طرف رائج ہے۔ اس میں مذکر مونث کی قید نہیں، یہ عورت مرد دونوں کے لیے آتا ہے۔ ''علامی'' بھی فارسی میں ہے، اور اس میں چھوٹی ی صیغۂ مبالغہ کی ہے، یعنی معنی وہی رہے، ''بہت عالم''۔ احتیاط صرف اتنی ضروری ہے کہ اللہ کو ''علامہ/علامی'' کے خطاب سے نہیں پکارتے، صرف ''علام'' کہتے ہیں۔ انگریزی میں کوئی ایک لفظ اس کا صحیح مرادف نہیں۔

سوال: ''حضور'' اور حضرت'' میں کیا فرق ہے؟ ''حضرت مولانا'' اور ''حضور تاجدار ملت'' جیسے فقروں کا استعمال کس حد تک صحیح ہے؟

جواب: اردو میں معنی کے لحاظ سے ''حضور'' اور ''حضرت'' میں کوئی فرق نہیں۔ روزمرہ اور محاورے میں استعمال کی بنا پر ان میں کہیں کہیں فرق آ گیا ہے۔ حسب ذیل پر غور کیجیے:

(1) آج حضرت نے توحید پر تقریر کی۔
(2) آج حضور نے...
(3) حضرت غالب کا قصیدہ بہتر ہے۔
(4) حضور غالب کا قصیدہ بہتر ہے۔

یہاں ایک اور تین بالکل ٹھیک ہیں، لیکن نمبر چار درست مگر خلاف محاورہ ہے۔ اکثر فقروں کے الفاظ متعین ہو گئے ہیں کہ ''حضور'' کہاں بولیں گے اور ''حضرت'' کہاں بولیں گے۔ عام طور پر ''حضور تاجدار ملت'' کہا جاتا ہے، لیکن ''حضرت تاجدار ملت'' غلط نہ ہو گا۔ اسی طرح ''حضرت مولانا'' اور ''حضور مولانا'' دونوں صحیح ہیں لیکن ''حضرت مولانا'' زیادہ رائج ہے۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ ''حضور'' میں ''حضرت'' سے زیادہ وقعت اور توقیر کا شائبہ ہے۔ لیکن یہ صرف استعمال عام پر ہے، جہاں جس طرح چل جائے وہی ٹھیک ہے۔ صرف ایک بات ہے کہ اردو میں ''حضرت'' کا لفظ بعض بزرگ شخصیات کے نام کے پہلے لگاتے ہیں، مثلاً ''حضرت میر تقی میر''؛ ''حضرت شہاب الدین شاہجہاں''؛ ''حضرت خواجہ نظام الدین صاحب اولیا''۔ لیکن یہ الفاظ غیر مسلم بزرگوں کے نام کے ساتھ بہت کم لگاتے ہیں، حالانکہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح، اپنے مذہبی رہنماؤں کو ہم ''حضور'' کہہ دیتے ہیں، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، جیسے ''حضور خواجہ معین الدین صاحب''؛ ''بی بی حضور صاحب''؛ ''حضور تیرتھنکر''؛ ''حضور رادھاسوامی جی'' وغیرہ۔ لیکن غیر ہندوستانی پیغمبروں کے لیے ''حضور'' نہیں کہتے۔ مثلاً ''حضور عیسیٰ علیہ السلام'' وغیرہ کہنے میں کوئی غلطی نہیں، لیکن یہ خلاف محاورہ ہے۔

(سوالات از راشد عمر انصاری، چھاتا باد، کترا اس گڑھ، دھنباد)

□□□

رفعت سروش

ڈاکٹر عبدالعلیم کی یاد میں

حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کی پہلی کل ہند کانفرنس میری زندگی میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر چہ ترقی پسند تحریک سے میری قربت 43-1944 سے دہلی میں مجاز، جذبی، اختر الایمان اور سجاد ظہیر سے ملاقات کے باعث تھی، مگر 1945 میں ممبئی پہنچنے اور سردار جعفری سے ملاقات کے بعد میری ہر شام کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں گزرنے لگی اور ڈاکٹر کنور محمد اشرف، سبط حسن، بنے بھائی اور کیفی اعظمی وغیرہ سے ملنے جلنے کے باعث میرے ادبی نظریات اور شعری آہنگ میں بھی تبدیلی آئی۔ اب تک میں لاہور کے رسائل ''ہمایوں''، ''ادبی دنیا'' اور ''شاہکار'' وغیرہ میں چھپتا تھا، اب میں ''نیا زمانہ'' اور نیا ادب میں بھی چھپنے لگا۔ اکتوبر 1945 میں سردار جعفری نے کہا کہ حیدرآباد کانفرنس میں چلنا ہے تو میں بخوشی تیار ہو گیا اس آٹھ روزہ کانفرنس میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ جن بزرگان ادب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ان میں فراق گورکھپوری، ڈاکٹر ملک راج آنند، مولانا حسرت موہانی، قاضی عبدالغفار، احتشام حسین، کرشن چندر، مخدوم محی الدین اور ڈاکٹر عبدالعلیم تھے۔ محسوس ہوا کہ ان میں سے ہر شخص اپنی جگہ ایک ادارہ ہے۔ ہم سب مندوبین ایک ہی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہر وقت خوش گپیاں، بحث و مباحثہ اور لطائف و ظرائف— سردار جعفری بحث کرنے کے ماہر، فراق چونکا دینے والی بات کرنے کے بادشاہ، سجاد ظہیر ہر بات میں دلچسپی لینے والے، مگر نفس مطلب کبھی الفاظ میں بیان کرتے کبھی مسکراہٹ سے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کی شخصیت میں ایک عجیب مقناطیسیت تھی۔ عالمانہ رعب ان کے چہرے سے ٹپکتا تھا۔ ذرا سی ڈاڑھی نے ان کے دانشورانہ وجود میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ گورا رنگ، اونچا قد، بھاری بدن، شیروانی ان پر زیب دیتی تھی۔ وہ نسبتاً کم بولتے تھے اور کسی سے بحث میں نہیں الجھتے تھے۔ جو کچھ بولتے حرف آخر کی طرح۔ (بحث میں لطف آتا تھا جب سردار جعفری اور ڈاکٹر ملک راج آنند ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے) سردار جعفری جوش کے بڑے مداح۔ ڈاکٹر آنند نے کہا کہ جوش کے یہاں لفظی طنطنہ اور غلغلہ ہے۔ ان کی نظموں کو انگریزی میں ترجمہ کریں تو گھاس پھونس معلوم ہوتی ہیں— احتشام حسین اور سبط حسن کی سنجیدہ مزاجی بھی محفل میں ایک توازن پیدا کرتی تھی۔ غرض اردو کی تین نسلوں کا زبردست اجتماع تھا۔ میں اس کانفرنس میں سب سے کم عمر تھا، اور زندگی کی اس پہلی کانفرنس میں بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ باہمی گفتگو کی بات اور ہے مگر میں نے اس کانفرنس کے مباحثوں میں ظاہر ہے کوئی حصہ نہیں لیا، سنا سب کچھ۔ ہاں مشاعروں میں اپنا کلام سنایا۔ ایک مشاعرے سے وابستہ ہے ڈاکٹر عبدالعلیم کی معرکتہ الآرا تقریر کی یاد۔

کانفرنس کے اختتام پر چادر گھاٹ کالج میں طلبہ کی یونین کی طرف سے مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر عبدالعلیم نے فرمائی۔ دن کا وقت— کالج کے طلبہ کے علاوہ وہاں اساتذہ اور کالج کے پرنسپل بھی موجود تھے۔ مشاعرے کی نظامت کالج یونین کے ایک ذمے دار عہدہ دار محافظ حیدر نے کی اس وقت پورے حیدرآباد میں انقلابی ادب و شعر کی فضا تھی۔ مشاعرے میں بھی انقلابی نظمیں پڑھی گئیں۔

ان دنوں ملک میں الیکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور سیاسی پارٹیاں اپنا اپنا مسلک عوام تک پہنچا رہی تھیں۔ پاکستان کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا۔ مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی نے مسلم لیگ کے موقف کی تائید کی تھی کہ ایک الگ ملک پاکستان بننا چاہیے اور کمیونسٹ پارٹی کے اس اقدام کی وجہ سے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے پاکستان کے مطالبے کی تائید میں ادب کی تخلیق شروع کر دی تھی۔ مخدوم محی الدین اور مجاز نے ایک مشترکہ ترانہ لکھا تھا۔ 1945 کے اوائل میں یہ ترانہ مجاز نے اردو بازار میں ایک جلسے کی قیادت کرتے ہوئے گایا تھا جو ان کی کتاب ''شب تاب'' میں محفوظ ہے:

آزادی کی دھن میں کس نے آج ہمیں للکارا
نیسر کے گردوں پر چمکا ایک ہلال اک تارا
سبز ہلالی پرچم لے کر نکلا لشکر سارا
سرمایے کا سوکھا جنگل اس میں سرخ شرارا
پاکستان ہمارا پاکستان ہمارا

سوا نیزوں پر ہے بھاری اک قرآن ہمارا
روک سکا ہے کوئی دشمن کب طوفان ہمارا
ہر ترک اپنا، ہر حر اپنا ہر افغان ہمارا
ہر شخص اک انسان یہاں ہے ہر انسان ہمارا
ہم سب پاکستان کے غازی پاکستان ہمارا

''نیا زمانہ'' میں پاکستان کی تائید میں اداریے اور نظمیں چھپ رہی تھیں۔ سردار جعفری کی فرمائش پر میں نے بھی ایک نظم— ''ووٹ کس کو دیں'' کہی تھی جو نیا زمانہ میں شائع ہوئی تھی۔ وہ نظم اس مصرعے سے شروع ہوئی تھی:

ووٹ اس کو دیں سنے جو غم زدہ دل کی پکار

اور اختتام اس شعر پر ہوا تھا:

جس کے لب پر نغمۂ آزادی انسان ہو
نعرۂ آزاد ہندوستان و پاکستان ہو

اور یہ تو سب جانتے تھے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مسلم لیگ کے لیے فضا سازگار تھی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے اپنی صدارتی تقریر میں شاعری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تقریر کا رُخ سیاست کی طرف موڑ دیا اور بہت پرزور الفاظ میں طلبہ کو خطاب کیا کہ آپ لوگ یہاں کالج کی چہار دیواری میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں، باہر نکلیے، کلاسوں کا بائیکاٹ کیجیے اور الیکشن کے لیے کام کیجیے۔ یہ تقریر سن کر کالج کے پرنسپل سنّاٹے میں آگئے۔ انھوں نے صفِ سامعین سے اُٹھ کر سخت احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب اپنے الفاظ واپس لیں۔ مگر ڈاکٹر عبدالعلیم نے اپنی بات پر اصرار کیا اور اس مطالبے کو وقت کی ضرورت قرار دیا۔ کالج یونین کے نمائندے محافظ حیدر نے بڑی دانشمندی اور جرأت سے کام لے کر علیم صاحب کی حمایت میں تقریر کی اور اپنے معزز مہمان کی عظمت پر حرف نہ آنے دیا۔

ڈاکٹر عبدالعلیم کی اس جسارت اور دلیری کا نقش میرے دل پر بیٹھ گیا اور میں ہمیشہ ان کی عظمت کا قائل رہا۔ ایک عرصے کے بعد 1960 کے آس پاس جب میں علی گڑھ کے کسی مشاعرے میں گیا تو قمر رئیس کے ساتھ ڈاکٹر عبدالعلیم کے دولت خانے پر حاضر ہو کر ان سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور ان سے مل کر محسوس ہوا کہ میرے تجربے میں اضافہ ہوا ہے۔ کیا اثر انگیز شخصیت تھی۔

ڈاکٹر عبدالعلیم عربی کے عالم تھے اور انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ ''قرآن کی الٰہیات'' پر لکھا تھا۔ قرآن شریف کتاب الٰہی ہے یا نہیں اس موضوع پر انھوں نے دنیا بھر کے دانشوروں کی تحریروں کو کھنگال لیا اور موافقت اور مخالفت میں مطبوعہ مواد جمع کیا— ایک بہت اہم موضوع پر ان کا یہ کام اپنی ہی نوعیت کا ہے۔ لیکن فاضل محقق نے اپنی حتمی رائے محفوظ رکھی۔

اسلامک اسٹڈیز کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالعلیم کا یہ کارنامہ یادر کھنے کے قابل ہے کہ انھوں نے علی گڑھ میں ''انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز'' یعنی ''ادارۂ علوم اسلامیہ'' کی بنیاد ڈالی اور وہاں ایک عرصے تک تعلیم دی۔ اب یہ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کہلاتا ہے۔

علی گڑھ سے ڈاکٹر علیم کو عشق تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انتقال کے بعد ان کا جسد خاکی دہلی سے ان کے آبائی وطن غازی پور نہیں، بلکہ علی گڑھ لے جایا گیا اور وہیں ان کی آخری آرام گاہ ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بدرالدین جی نے یونیورسٹی کے انتظامی ڈھانچے میں کچھ تبدیلیاں کی تھیں۔ بدرالدین طیب جی کے بعد جب ڈاکٹر عبدالعلیم مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو دانشور طبقے نے خاص طور پر اطمینان کا سانس لیا۔ ان دنوں وہاں ایک جملہ عام تھا کہ ''اب تو اپنے وائس چانسلر ہیں۔'' مجھے یاد ہے کہ ان دنوں معین احسن جذبی ایک بار اردو مجلس میں ریکارڈنگ کے لیے آئے۔ میں نے پوچھا ''آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟'' جذبی کا جواب تھا کہ ''اب ذرا ماحول سازگار ہوا ہے علیم صاحب وائس چانسلر ہوگئے ہیں۔ اب لکھیں گے۔''

علیم صاحب اول و آخر ترقی پسند تھے، مگر ان کی پہچان اسلامی علوم کے ماہر کی حیثیت سے تھی۔ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کے راوی ایک معتبر شخص ہیں۔ علیم صاحب مراکش گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے واپس آنے والے ہی تھے کہ رباط میں ''اسلامک آرگنائزیشن کانفرنس'' منعقد ہونا طے ہوا اور ہندوستانی وفد کو دعوت دی گئی۔ حکومت ہند نے ڈاکٹر علیم سے کہا کہ آپ وہیں رہیں اور اس کانفرنس میں شرکت کریں۔ ان دنوں کنول نین بخشی مراکش میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ حکومت نے رباط کو اطلاع دے دی کہ ہندوستان کا دو نفری ڈیلی گیشن ڈاکٹر عبدالعلیم اور کنول نین بخشی پر مشتمل کانفرنس میں شرکت کرے گا۔ پاکستان میں ان دنوں یحییٰ خان کی حکومت تھی اور انڈو پاک کے تعلقات بہت کشیدہ تھے۔ یحییٰ خان اس بات پر اَڑ گئے کہ اس کانفرنس میں ہندوستان کے ڈیلی گیشن کو شرکت نہیں کرنی چاہیے۔ یہ دونوں حضرات رباط میں رہے اور دو روز کے تعطل کے بعد آخر مراکش کی حکومت کو یحییٰ خان کے مطالبے کے آگے جھکنا پڑا او رحکومت مراکش نے ہندوستانی حکومت سے معذرت کر لی اور ڈاکٹر عبدالعلیم واپس آگئے۔ مگر ہندوستان نے اس ڈرامائی ردّ و بدل میں اپنی سبکی محسوس کی اور مراکش سے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے اور کئی سال بعد دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات بحال ہوئے۔

وائس چانسلری کی مدّت ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر علیم ترقی اردو بورڈ کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ اس ادارے کا ابتدائی زمانہ تھا اور انھوں نے اس پُر بہار پودے کی آبیاری کی، اپنے فکر و عمل سے پروان چڑھایا اور زبان و ادب کے فروغ کے لیے عمر کے آخری دور میں یہ کام کیا۔ یہاں ان پر قلب کا حملہ ہوا اور ولنگڈن ہسپتال میں انھوں نے اپنی جان جاں آفریں کو سونپ دی اور اب علی گڑھ میں محوِ خواب ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعلیم ترقی پسند نظریات اور بائیں بازو کی سیاست کے زبردست حامی تھے اور اس کے ساتھ ہی علمی طور پر وہ اسلامی علوم کے ماہر تصور کیے جاتے تھے۔ اس حسین امتزاج کے باعث وہ ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ اس ضمن میں اگر کسی دوسری شخصیت کا خیال آتا ہے تو وہ تھے مولانا حسرت موہانی۔

ڈاکٹر عبدالعلیم ان لوگوں میں سے تھے جنھیں اپنے نام اور شہرت کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ صرف علم و فن کے بے بہا خزانے کو دوسروں تک منتقل کرنے میں سکون محسوس کرتے تھے۔ ترقی پسند اور دانشوروں کی صفوں میں ایسا ایک اور نام ہے ڈاکٹر کنور محمد اشرف کا جن کے تحقیقی مقالے کے علاوہ ان کی کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کی تحریروں کو جمع کرنا اور انھیں ایڈٹ کر کے شائع کرنا نئی نسل کا فریضہ ہے۔

□□□

204, Saba Apartment, D-3,
Sector-44, Noida-201301 (U.P.)

کملیشور

ہندی اور اردو کی مشترکہ وراثت

عوام الناس کے سامنے اور ان کی اوسط یادداشت میں 1857 کی تحریک آزادی کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ انگریزوں کے بڑھتے اقتدار اور غلامی کے خلاف یہ جنگ بھارت کے ہندو مسلمانوں نے کندھے سے کندھا ملا کر لڑی تھی اور یہ کہ ہندوستان کی تاریخ وسطیٰ میں یہ نادر واقعہ پہلی بار رونما ہوا تھا، وگرنہ اس ملک میں ہندو اور مسلمان، راج رجواڑے، ہمیشہ آپس میں ہی لڑتے رہے تھے، جس کی وجہ سے انگریزی حکمرانوں کو یہاں پاؤں جمانے اور ملک کو غلام بنانے کی سہولت اور ماحول مل گیا تھا۔ ہمارے بعض تاریخ نویسوں نے بھی اسے اسی یکطرفہ نظریے سے دیکھا اور اس کی تشریح کی ہے۔ اس سے ہماری ذہنی سوچ کا ایک زاویہ بنتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف 1857 میں لڑنے کے لیے ہندوستان کی جاگیردارانہ سلطنتی ہندو مسلم طاقتوں کا ناممکن میل ملاپ لگ بھگ یکا یک ہوا تھا۔

ہندی اردو زبانوں کے عوامی پہلوؤں پر مبنی تاریخ کو اگر دیکھا جائے تو ہم شمالی ہند کی مشترکہ لسانی اور ثقافتی وراثت کو واضح طور پر نشان زد کر سکتے ہیں اور اس وراثت کے صحیح حقدار مانے جا سکتے ہیں۔ سائنسی نظریے سے نویں سے دسویں صدی کے اس دور کی زبان کو اپ بھرنش سے ترقی کرنے والی پرانی ہندی کہا گیا ہے۔ یہ بھی مانا گیا کہ آریہ زبانوں کے ارتقا کا تیسرا مرحلہ اپ بھرنش دور ہے۔ پراکرت کا مطلب فطری یا پہلے سے ہی بنی ہوئی زبان ہے، اسی طرح اپ بھرنش کا مطلب ہے عوامی بولی یعنی عوام الناس کی بولی۔ بھرت منی کے مطابق اپ بھرنش بول چال کی زبان تھی۔ پاتانجلی نے بھی ''شبد سندر بھ'' میں اپ بھرنش کے لیے اپ شبد (حقیر لفظ) یا ملیچھ کا استعمال کیا ہے۔ سنسکرت کے ''واچسپتی کوش'' میں بھی اپ بھرنش کے معنی گرامیہ بھاشا (دیہی زبان) ملتے ہیں۔ اس طرح اپ بھرنش لفظ کا مطلب ہوا وکرت (بگڑا ہوا)، بھرشٹ یا غلط، یعنی جو زبان اپنے وقار اور شکل سے گری ہوئی ہو۔ اس کا ذکر سب سے پہلے پاتانجلی نے کیا، جنھوں نے اپ بھرنش لفظ کو کئی زاویوں سے دیکھا، پرکھا اور چنانچہ باہر کر کے اسے بھرشٹ ہونے کا منصب دیا۔

ملکی اور غیر ملکی عالموں نے اس کے نام کو قبول کرتے ہوئے بھی اسے آریہ نسل کی ملکی زبان ہی مانا ہے۔ یہ زبان اپنی پیش رو زبانوں کے میل جول اور تعاون کا ہی نتیجہ تھی جو کہ وقت کے ساتھ ارتقا پذیر ہوئی۔ گیارھویں صدی تک عوامی زبان کی شکل میں اپ بھرنش شمالی ہند سے جنوب تک پوری طرح پھیل چکی تھی اور پھر دھیرے دھیرے سست اور کمزور پڑتی ہوئی یہ خود کو سولھویں صدی تک کھینچ لے گئی۔

اپ بھرنشوں سے ہی جدید ہندوستانی زبانیں نمودار ہوئی ہیں — براچ سے سندھی، کیکیے سے لہندا، تک سے پنجابی، مہاراشٹری سے مراٹھی، شورسینی سے برج، گجراتی، راجستھانی، مغربی ہندی اور پہاڑی، اردھ ماگدھی سے مشرقی ہندی اور ماگدھی سے بہاری، بنگلہ، آسامی اور اڑیا۔ اس طرح شورسینی اپ بھرنش کی بیساکھی پر قدیم ہندی چل نکلی، جسے ابتدائی ہندی، ہندوی یا دیش بھاشا کا نام ملا اور اسی سے ہندی اردو کی جڑ ملی ہوئی ہے۔ اس طرح قدیم ہندی (ہندی اردو) کی پیدائش نویں دسویں صدی میں ہو گئی تھی۔

چندر دھر شرما گلیری جی کے مطابق جین ادب میں اور ہیم چند کے ''پراکرت ویاکرن'' نیز دیشی ناگ ماتا میں بھی کھڑی بولی کے آثار موجود ہیں۔ ناتھ فرقے کے گرو گورکھ ناتھ کے ساتھ ہی چرپٹ ناتھ نے بھی ہمیں کھڑی بولی کی آہٹ دے دی تھی اور چند بردائی نے ''پرتھوی راج راسو'' میں کھڑی بولی کی ان صورتوں کو سمویا ہے، جو آج بھی جدید ترین ہیں۔

سولھویں صدی کے سنت ایکناتھ، سنت تکارام سے پہلے ہی شمالی ہند میں کبیر لہر چل پڑی تھی اور بھکتی کال کا آغاز ہو چکا تھا اور یہ دور جیسا کہ ادب کی کچھ تاریخوں میں کہا گیا ہے ''ہندو برادری کی زوال پذیر ذہنیت کا دور تھا۔'' یہ ایک گپت نظریہ تھا، کیونکہ عام لوگوں کی نظر سے اگر تمام سماجی علوم کے شواہد کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے، تو یہ زوال پذیر ذہنیت کا دور نہیں بلکہ لسانی و ثقافتی

● کملیشور ہندی ادب کے ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے انتقال 27 جنوری 2007; سے چند ہفتے قبل 23دسمبر 2006 کو بھارتیہ انوسندھان پریشد (انڈین ریسرچ کونسل) کے سیمینار میں اپنی تقریر میں اردو ہندی کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ یہ تقریر ہندی دوماہی رسالے ''ہری کتھا'' کے شمارہ مئی جون 2007 میں ''ہندی اردو وراثت کی ساجھی پہچان'' کے عنوان سے صفحہ 87 پر شائع ہوئی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ قارئین کے لیے بلاتبصرہ پیش خدمت ہے۔

(مترجم)

اشتراک کا سب سے اہم اور ترقی پذیر دور تھا۔ اشتراک کا یہ دور گذشتہ سات صدیوں سے، اپنے تضادات، بنتے بگڑتے معاملات اور اونچ نیچ کے باوجود چلا آ رہا تھا، جسے اورنگ زیب جیسا ممتاز مذہبہ بادشاہ بھی رد کرنے کی حیثیت میں نہیں تھا۔

اورنگ زیب کی بدنام زمانہ اسلام پرستی اور ثقافتی غیر فراخدلی بھی اس ثقافتی اشتراک کے عمل کو متاثر نہیں کر سکی، جو صدیاں پار کرتا ہوا انگریزی اقتدار کے خلاف 1857 میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ہندوستان کے وقار کی جنگ لڑتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ دنیا کے کچھ ممالک میں مذاہب کی باہمی مخالفانہ جدوجہد چاہے ہوتی رہی ہو لیکن بھارت میں مذہبی جنگوں کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ بھارت نے ہی اس سوچ کو جنم دیا ہے کہ تہذیبوں کا سنگم ہی ہوتا ہے، سنگھرش نہیں۔ یہی ہندی اور اردو زبانوں کی سچائی بھی ہے، کیونکہ ان دونوں زبانوں ہندی اور اردو نے ہندوستانی وراثت سے جنم لیا تھا، جسے ''ہندوی'' پکارا گیا تھا۔ تاریخ کی بدلتی کروٹوں کے ساتھ اسی کو وقفے وقفے سے کئی زبانوں کے اثرات بھی جھیلنے پڑے۔

وقتاً فوقتاً نہ جانے کتنے ملکی اور غیر ملکی لسانی گروہوں کے سیلاب آئے اور وہ اس کے اوپر اپنی چھاپ چھوڑتے گئے لیکن کھڑی بولی ہندی اور اردو کی اصل فطرت پھر بھی ایک سی بنی رہی اور لگاتار ارتقا پذیر رہی۔ اس زبان کے لیے ہندوئی، ہندوی، ہندی اور اردو ناموں کا استعمال ہونے لگا۔ امیر خسرو نے اپنے دیوان ''غرۃ الکمال'' کی تمہید میں تسلیم کیا ہے کہ ان سے پہلے گیارھویں صدی میں فارسی کے ایک شاعر مسعود بن سعد سلیمان (1054-1131) نے بھی ہندوی میں شاعری کی تھی۔ اس نے تین دیوان عربی، فارسی اور ہندوی میں لکھے تھے۔ اس کی تصدیق کئی تاریخ نویسوں نے کی ہے۔ اسی وراثت اور ملی جلی پہچان کو لے کر ہندی اور اردو، دونوں چل رہی ہیں۔ دونوں کی ثقافتی اور خاندانی جڑ ایک ہے اور اپنے اپنے مخصوص ذائقے اور پہچان کے ساتھ یہ ارتقا پذیر ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔

□□□

(مترجم: محمد عطا حسین انصاری)

پتہ:
Baitul Ata,Mohalla Faqira Khan (Urdu Bazar),
Darbhanga - 846004

مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

مصنف: وہاب قیصر

''مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت'' میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا آزاد کی سوانح، تحریریں، صحافت اور وزارت میں جہاں کہیں بھی سائنسی مزاج، سائنسی اصول اور سائنسی برتاؤ نظر آئے انھیں ضبط تحریر کیا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں موصوف نے مولانا کے لیے سائنس کی تعلیم کا حصول، مولانا آزاد کا سائنسی شعور، غبار خاطر سائنس کے تناظر میں، البیرونی اور جغرافیۂ عالم اور مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپے

تاریخ تعلیم ہند

مصنف: سیّد نوراللہ/ جے. پی. نائک، مترجم: مسعودالحق

اس کتاب میں 1765 سے 1947 تک ہندوستان میں عہد بہ عہد ہونے والی تعلیمی تبدیلیوں کا مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جدید تعلیمی تاریخ کی ہر اہم منزل پر ایک مکمل اور جامع تبصرہ کرنے، ہر اہم فیصلے کے پیچھے کارفرما اسباب اور ان کے اثرات کو سمجھانے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کس طرح وجود میں آیا ساتھ ہی یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیمی اقدام صرف حال ہی کے سمجھنے میں معاون نہ ہو بلکہ مستقبل کی اصلاحات اور تنظیم نو کے رخ کی بھی نشان دہی کرے۔

صفحات: 552، قیمت: -/111 روپے

صغیر اشرف

جدید افریقی شاعری

حبشی نژاد ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو وقتاً فوقتاً نیگرو ادب یا نیگرو شاعری کے نام سے پڑھا، اور جانا گیا ہے۔ ان حبشی قبیلوں کے آباؤاجداد صدیوں پہلے برطانیہ، امریکہ، لاطینی امریکہ، جرمنی اور فرانس جیسے ممالک میں جا کر آباد ہوگئے تھے۔ اس لیے بہت سے نیگرو ادیبوں اور شاعروں کو اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے غیر ملکی زبانوں کا سہارا لینا پڑا اور انھوں نے لکھا۔

چھ سات سو برس پہلے جب مغربی ممالک نے جنوبی افریقہ پر بہ زور طاقت قبضہ کرلیا تو وہ افریقہ جو ایک اکائی کی صورت میں تھا، نیست و نابود ہوگیا۔ سامراجی طاقتوں نے افریقیوں پر اپنے قوانین اور طور طریقوں کو اس طرح لاد کر دیا کہ افریقی نہ صرف اپنی ثقافتی شناخت سے محروم ہوگئے بلکہ اپنا وہ بنیادی وصف بھی کھو بیٹھے جسے Negro Sprit کہا جاتا ہے۔ یوروپ کے بیشتر باشندے افریقہ کو شیروں، جنگلوں، سانپوں اور جنگلی لوگوں کے مسکن سے تعبیر کرتے تھے۔ جبکہ جنوبی افریقہ کی دولت محض اس کے گھنے جنگل اور انواع و اقسام کا خام مال ہی نہیں وہاں کے باشندوں کی ذہنی اور جسمانی توانائی بھی تھی۔

صدیوں تک جس طرح ان لوگوں کی جسمانی توانائی کا استحصال کیا جاتا رہا اس سے زیادہ تر لوگ واقف ہیں۔ افریقیوں کا ذہنی استحصال بھی ہوا۔ سامراجی قوتوں نے مقامی زبانوں کو جن میں نوری، ہوزا، ممانا، اور فلانی زبانیں شامل تھیں، پنپنے نہیں دیا۔! افریقی اس صورتِ حال پر موثر احتجاج اس لیے نہ کر سکے کہ وہ غلاموں کی زندگی جی رہے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر تک افریقی باشندوں کو غلاموں کی طرح خریدا اور بیچا جاتا رہا۔ 1885 میں مغربی طاقتوں نے غلاموں کی تجارت کو غیر قانونی قرار تو دے دیا لیکن افریقیوں کو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ پورا افریقہ جرمن، فرانس، برطانیہ اور اسپین کی کالونیوں میں تقسیم ہوگیا۔ بعض حصوں پر بوتھا Botha نسل کے لوگ حکومت کرتے رہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے ختم ہوتے ہوتے حالات میں کچھ تبدیلی آئی، لیکن زبان و ادب کے محاذ پر سکوت قائم رہا۔ کسی ادیب یا شاعر کی کوئی تصنیف اس دوران شائع نہیں ہوئی۔ رفتہ رفتہ جب افریقی ملک آزاد ہوئے تو یہ محاذ بھی گرمایا اور نظم و نثر میں کچھ تصانیف منظرِ عام پر آئیں۔

آزاد کانگو کے پہلے وزیر اعظم پیٹرک لومبا کی تقریروں کو افریقی ادب کے نامور مورخ کلاڈ وادیر Claud-Wauthier نے اعلیٰ ادب کا نمونہ قرار دیا تھا، لیکن لومبا نے جب یہ اعلان کیا کہ افریقہ اپنی تاریخ خود لکھے گا تو سامراجی طاقتوں نے انھیں پھانسی دے دی۔

لومبا کے قتل کے پہلے سے ہی افریقی ادب کروٹیں بدلنے لگا تھا۔ علی عون، کے زیر ادارت 1946 میں پہلا افریقی رسالہ پیرس سے شائع ہوا جس میں افریقی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے احساسات و جذبات ملک اور بیرون ملک (مغربی ممالک) تک پہنچے۔ اس ادارے نے کئی افریقی شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو مجموعی شکل میں بھی شائع کیا۔ افریقی نواد ادیبوں کی روم، قاہرہ، اور تاشقند میں کئی کانفرنسیں بھی منعقد ہوئیں۔ اس دوران ایل. جی. ذراماس کی ایک کتاب ''بلیک لیبل'' شائع ہوئی جس میں انھوں نے سیاسی جبر اور مختلف پابندیوں کے باوجود ایک نئے عہد اور ایک انداز فکر کے خیر مقدم کی بات کہہ کر افریقہ کے ادیبوں اور شاعروں کو اپنے حقوق، اپنی ذمے داریوں کا احساس دلایا اور غربت و جہالت، سماجی و سیاسی سطح پر نسلی امتیازات و تعصبات، عدم مساوات کی لعنت جیسے موضوعات پر لکھنے کی ترغیب دلائی۔ اس دور کی افریقی شاعری بنیادی طور پر سیاسی موضوعات کا احاطہ کرتی تھی۔ سامراجی باقیات، نسلی امتیاز کی بنیاد پر کیے جانے والے مظالم، غلاموں کی خرید و فروخت کے بدترین درد کی تلخ یادیں ان کا خصوصی موضوع تھیں۔ دو ڈھائی دہائیوں قبل تک بھی بیشتر افریقی باشندوں کی زندگی جہنم بنی رہی۔ ناقابلِ برداشت دکھوں کے اژدہے منھ پھاڑے ان کی طرف بڑھتے نظر آتے تھے جو ان کے احساسات کو مجروح کردیتے تھے۔ افریقی شاعر ''اگسٹینو نیٹو'' (Augustinio-Neto) نے افریقیوں کی دکھ بھری زندگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

ہم افریقہ کی ننگی بھوکی اولاد ہیں
ہمارے بچوں کو تعلیم میسر نہیں
وہ چیتھڑوں کی گیندیں بنا کر
تپتی دوپہر میں کھیلتے ہیں
ہم وہ کرائے کے ٹٹو ہیں
جو کافی کے کھیتوں میں کام کرتے کرتے مرجاتے ہیں
ہم سیاہ فام ہیں
سفید فام لوگوں کی عزت کرنا

دولت مند لوگوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا
ہمارا مقدر ہے.....!
ہم انسان ہیں
جو دوسرے انسانوں سے ڈرتے ہیں!

افریقی شاعروں کو یقین تھا کہ مصیبتوں اور تکلیفوں کے کالے بادل ایک نہ ایک دن ضرور چھٹ جائیں گے اور انھیں آزادی کا سورج دیکھنا نصیب ہوگا۔ مشہور شاعر پیر بامبوٹ، نے حزن آلود مگر پر یقین الفاظ میں کہا:

ہمیں قتل کیا جاتا ہے
ہم آج بھی اپنے ہاتھوں
اپنے گھٹنوں کے بل جھکنے پر مجبور ہیں
لیکن ہم برابر آگے بڑھ رہے ہیں
سیاہ فام ساتھیو!
ہمت سے کام لو
ہم ایک نہ ایک دن اپنی منزل پر ضرور پہنچیں گے

افریقیوں کو مہذب بنانے کے لیے خود ساختہ برتر طاقتیں، تہذیب کے پردے میں اپنی بربریت اور قوت کا دائرہ وسیع کرنے کی کوششوں میں منہمک رہیں جنھیں بہت سے افریقی شاعروں نے اپنے گہرے طنز کا نشانہ بنایا۔ ایک شاعر کہتا ہے:

دیکھو!
تہذیب کے ٹھیکیدار آرہے ہیں
ان کے ہاتھوں میں بائبل کی توپ ہے
جس کا نشانہ ہمارے دل ہیں
ہماری زمین ہمارے ہی خون سے تر ہے

براہِ راست انداز میں کی گئی شاعری کے ساتھ ساتھ بعض جدید شعرا نے رمزیہ اور استعاراتی لہجے سے بھی کام لیا۔ ایک افریقی شاعر آرمانوز Armattoes اپنی ایک نظم میں کہتا ہے:

اے افریقہ!
میں تیرے لیے نرم روشنی والا
ایک تاج بناؤں گا
تیرا راستہ
دودھ کی طرح صاف و شفاف ہوگا
میں.....
آگ کے حروف سے تیرا نام لکھوں گا!
جب وہ آزادی سے ہمکنار ہوئے اور انھیں کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا تو بہت سی نظموں میں ان کی دلی آرزوئیں اس طرح ظاہر ہوئیں:

ابھی تک.....
ہماری دولت اور ہماری معصومیت کی بنیاد پر
اغیار نے اپنی سلطنتیں کھڑی کیں
خداوند!
اب ہمیں ایسے گلے بان عطا کر
جو ذاتی منفعت اور ذاتی امارت کے
جذبے سے پاک ہوں
اور جن پر ہم بھروسہ کرسکیں!

افریقی شاعروں کو اپنی تاریخ کی گم شدگی کا شدید احساس تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ اپنی جڑوں کو ازسرِ نو دریافت کیے بغیر اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت نہیں کرسکتے۔ مقفّر اور موزّخ شیخ انٹا نے مختلف افریقی زبانوں کے لوک ادب کو ازسرِ نو ترتیب دے کر اور دائرۂ تحریر میں لاکر کہانیوں اور داستانوں کی بنیاد پر افریقہ کی حقیقی روح تک رسائی کی کامیاب کوشش کی۔ احمد ہمیانی با، نے اس موضوع پر تحقیق کرکے لوک شاعری کے کئی مجموعے شائع کیے۔ انسانیت سے بھرپور جذبے کا اظہار کرنے والی وسیع القلب روحوں سے افریقی شاعروں نے محبت اور اخوت کا جو سبق سیکھا، اسے اپنی شاعری میں کچھ اس طرح رقم کیا:

اے میرے دل
میں ان لوگوں سے نفرت نہ کروں
جو ناقابلِ نفرت ہیں
مجھے پوری انسانیت سے محبت کرنے کی بھوک
اور انسانی اقدار کی بے پایاں پیاس عطا کر.....!

مارشل سند اناری، ایک افریقی شاعر نے ایک نظم میں ماضی بعید کو ان لفظوں میں اجاگر کیا ہے:

غلاموں کی تجارت
افریقہ کے جسم میں ایک ایسا گھاؤ ہے جو
کبھی مندمل نہیں ہوسکتا
بدن پر برستے ڈنڈوں
اور گلے میں پڑی ہوئی رسّیوں کی بو
آج بھی میرے خیالات کی طوفانی لہروں
سے ٹکراتی رہتی ہے—!

□□□

پتہ:
Ex. Post Master,
Khatima (U.S.Nagar)
Uttrakhand - 262308

سید حامد

گواسکر کا بیان

دنیا جانتی ہے کردار قابلِ تقسیم نہیں ہوتا اور شعور کے ٹکڑے کرنا بھی ممکن نہیں۔ صاحب کردار دراصل ہو بھی وہی شخص سکتا ہے جو شعور یا اچھائی اور برائی میں فرق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ہندوستان نے کرکٹ میں دو ایسے کھلاڑی پیدا کیے جن کی دھاک دنیا بھر میں بیٹھ گئی۔ ایک سنیل گواسکر، دوسرا سچن تیندولکر۔ گواسکر نے بلے باز کی حیثیت سے اپنا لوہا منوالیا، عالمی ریکارڈوں کے انبار لگا دیے۔ یہی نہیں اس نے صاحب شعور اور صاحب کردار ہونے کے ثبوت بھی فراہم کردیے۔ اخلاقی قدروں پر اس کی گرفت اتنی ہی مضبوط تھی جتنی کرکٹ بیٹ پر اور یہی ہمارا آج کا موضوع ٹھہرا۔ لہٰذا اس وقت ہم تیندولکر کے امتیازات کا ذکر نہیں کریں گے۔ قارئین کو یاد ہوگا۔ 1993 کے فسادات کے دوران جب ہندوتو کا ایک گروہ بے گناہوں اور بے بسوں کو تہ تیغ کرنے کے لیے بڑھ رہا تھا تو گواسکر گھر سے نکل آیا اور جان کی بازی لگا کر مظلوموں اور محصوروں کی حفاظت پر کمربستہ ہوگیا۔

گذشتہ ماہ کی بات ہے جب آسٹریلین کرکٹ ٹیم اور ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی مہاجات اور مغلظات کا سرِ میدانِ تبادلہ کرکے ''سلے جنگ'' کے ذریعے کرکٹ کے چہرے کو مسخ کررہے تھے اور ہم ہندوستانی اس بات پر برہم تھے کہ آسٹریلیا والے ہمیشہ دشنام طرازی اور تہمت آفرینی میں پہل کرتے ہیں۔ ''سلے جنگ'' یعنی کرکٹ کے دوران بدزبانی اور بدکلامی کو انھوں نے نقطۂ عروج تک پہنچا دیا تھا۔ ماجرا یہاں ترکی بہ ترکی کا تھا۔ سنیل گواسکر نے جو نیک و بد کا شعور رکھتا ہے، عوام کی طرح غصے کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا، نہ حریف پر اندھا دھند حملے کرتا۔ اس نے یک روزہ کرکٹ کے سات میچوں کے دوران گالیوں میں جو تبادلۂ خیالات ہوتا تھا، اس کی سخت مذمت کی۔ کسی ایک فریق کو نشانہ بنائے بغیر ٹھنڈے دل سے صورت حال کا جائزہ لیا۔ اس نے کہا کہ قصور کسی ایک ملک کا نہیں، دونوں ٹیموں کی منتظمہ کا ہے (کھلاڑیوں کی پرچھائیں تماش بینوں پر بھی پڑگئی)۔ منتظمہ نے آخر حالات کو اس حد تک بگڑنے ہی کیوں دیا۔ اور کرکٹ کے اس تنزل کی ذمے داری میں آئی سی سی کے میچ ریفری اور میچوں کے امپائروں کا حصہ بھی ہے۔ وہ دونوں ٹیموں کے کم سے کم ایک کھلاڑی کے خلاف رپورٹ اور تادیبی کارروائی تو کرہی سکتے تھے۔ وان کھیڈے اسٹیڈیم میں کھیل کے دوران ایک ہندوستانی بلے باز اور ایک آسٹریلین فیلڈر جنگجویانہ انداز سے ایک دوسرے کے سامنے آگئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت دونوں امپائر کیا کررہے تھے۔ دو میں سے ایک امپائر اعداد و شمار قلمبند کررہا تھا۔ دوسرے امپائر نے بھی کھلاڑیوں کی اس بے مہار مخاصمت کو فرو کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ تماشائی بھی اس پرخروش مکالمے میں حصہ لینے لگے تھے اور ہنگامی صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ اس پر ستم یہ کہ ریفری نے بھی اس نزاع کی طرف سرے سے دھیان ہی نہیں دیا۔ کیا وہ سمجھتا تھا کہ اس کا کام جب ہی شروع ہوگا جب امپائر رپورٹ کریں۔ چونکہ کھیل کے نگراں پہلے میچوں میں متواتر غفلت برتتے رہے اس لیے بدزبان کھلاڑیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ حتیٰ کہ وہ ہاتھاپائی کے درپے ہوگئے۔ گواسکر نے اصرار کیا کہ امپائروں کی کارگزاری کو تحت نظر رکھنا چاہیے ورنہ ایک خوبصورت کھیل زبانی انتہاپسندی کے ہاتھوں تباہ ہوجائے گا۔ اس نے جرأت اور فراست کے ساتھ جوابدہی کے اس اصول کی وکالت کی۔ جوابدہی دراصل اخلاق و کردار کی بنیاد ہے۔

انگریزی محاورہ میں کرکٹ کا مفہوم تھا شرافت، انصاف پسندی، خوش اطواری، خود کو دوسرے کی جگہ رکھ کر فیصلہ کرنا، نفاست، لطافت، دوسروں کے جذبات کا پاس، لیکن کرکٹ کے میدان میں آج کل جو کچھ ہورہا ہے وہ اس مفہوم کے بالکل برعکس ہے۔ اس وقت جیتنے کی ریس اور اس کی ہوس اور زر کی طمع میں انسان نے اس دلکش کھیل کی ساری خوبیوں کو روند ڈالا ہے۔ اس خوشنما کھیل کی ساری لطافتیں ہوسِ زر کی نذر ہوگئی ہیں۔ حب الوطنی کے لطیف جذبے کو بھی زبانی کثافت اور تشدد نے پامال کردیا ہے۔ اچھائیوں پر ہر طرف سے برائی یورش کررہی ہے۔ ترقی کے جذبے، مقابلے کے دلولے نے ایک کرخت دھینگامشتی کی شکل اختیار کرلی ہے۔ آج کل کھیل وہی ترقی کرتا ہے جس میں پیسہ ہو۔ گویا کھلاڑیوں کی لو کھیل سے نہیں لگی ہے، دولت سے لگی ہے۔ تہذیب نے اپنے دامن میں جن اچھائیوں کو سمیٹا تھا، پروان چڑھایا تھا، جن خوبیوں اور خوبصورتیوں، نفاستوں، لطافتوں اور شرافتوں کو فروغ دیا تھا، ان سب کو دولت کی تلاش اور اس کے نشے نے پامال کردیا ہے۔ کرکٹ میں دولت کی ریل پیل ہے، اس لیے یہ کھیل سب کی آنکھوں کا تارہ بن گیا ہے اور فٹ بال کو چھوڑ کر دوسرے کھیل یتیم ہوگئے ہیں۔ ہندوستان میں ہاکی جس پر ہمیں ناز تھا خالی کشکول لیے کسمپرسی کے عالم میں گھوم رہی ہے۔

اب ایک نظر تماشائیوں پر ڈالیے۔ ہے نہ یہ بات افسوسناک کہ جو لوگ کھیل دیکھنے بیٹھتے ہیں۔ اپنا قیمتی وقت اس پر صرف کرتے ہیں کھیل کے

لطائف وظرائف ونکات سے حظ اندوز ہونے کے بجائے میچ کوتعصب کی عینک لگا کر دیکھنے لگے ہیں۔ کھلاڑی سرمیدان کف بدہن ہوتے ہی ہیں، کھیل دیکھنے والے ان سے بھی زیادہ حواس باختہ ہوجاتے ہیں۔ کھیلوں کی بابت عام رائے تھی کہ ان سے مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ نہ جیت پر بغلیں بجائی جاتی ہیں، نہ ہار پر منہ لٹکایا جاتا ہے۔ انسان کی شخصیت شکست و فتح دونوں پر حاوی ہو جاتی ہے، دونوں سے بالاتر ثابت ہوتی ہے۔ ان میں شریک ہوکر انسان زندگی ڈھنگ سے بسر کرنا سیکھتا ہے۔ لیکن فی زمانہ کھیلوں کا جب ذکر آتا ہے تو سیکھنے کے بجائے تہذیب نے جو کچھ سکھایا ہے اسے بھول جانے کی طرف ہی دھیان جاتا ہے۔ جانبداری، عداوت شعاری، طیش، برہمی اور گرم گفتاری، تلخی، عصبیت اور دل آزاری کا ورد کھلاڑی بھی کرتے ہیں اور کھیل کے ناظرین اور شائقین بھی۔

گواسکر نے کرکٹ میں کھلاڑیوں اور تماشائیوں کی دریدہ دہنی اور کرکٹ کے نگرانوں اور پاسبانوں کی فرض ناشناسی، جواب نادہی اور تغافل پیشگی کے خلاف بروقت صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ کرکٹ اور دوسرے کھیلوں پر ہی کیا منحصر ہے کسی تنظیم یا ادارے کو لیجیے اس کے پاسبان یا نگراں اگر ڈھیل سے کام لیتے ہیں، غفلت برتتے ہیں یا مروت اور خوف، مرعوبیت یا عصبیت کا شکار ہوجاتے ہیں تو اس تنظیم یا ادارہ کو برباد ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ یہ کوتاہ اندیش اور سہل انگار اور عشرت پیشہ اشخاص ذرا دیر کو بھی یہ نہیں سوچتے کہ جو تنظیم یا انجمن یا ادارہ سالہا سال بلکہ کبھی کبھی صدیوں کی عرق ریزی کے بعد کھڑا کیا گیا ہے وہ کسی فردِ واحد کی جاگیر نہیں ہے۔ وہ صالح روایت جو صدیوں میں تشکیل ہوئی ہے اسے لاکھوں انسانوں اور صدہا لمحات نے تیار کیا ہے۔ تنگ نظر افراد کی غفلت اور خود غرضی سے اگر اسے برباد کردیا گیا تو یہ کتنا بڑا اور ناقابل تلافی نقصان ہوگا اور ان افراد کے نامۂ اعمال میں کتنا بڑا جرم لکھا جائے گا۔

ہم اکثر ان گناہوں کی پشیمانی کا خراج دیتے ہیں جو اپنی نجی زندگی میں بحیثیت ایک فرد کے ہم سے سرزد ہوتے ہیں۔ غافل اس سے کہ اس سے زیادہ سنگین اور انسانیت کے لیے نقصان رساں ہوتی ہیں ہماری غفلت جن کا نقصان اداروں یا تنظیموں کو نادانستہ پہنچتی ہے۔ لہٰذا اچھا ہو اگر اخلاقیات کو دو خانوں میں بانٹ دیا جائے۔ اول وہ اخلاقی امور جن کا نفع یا نقصان مخصوص فرد تک محدود رہتا ہے، دوسرے وہ اخلاقی امور جو اداروں، انجمنوں، جماعتوں، قوموں کو نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں۔ اجتماعی ضوابط اخلاق میں دانستہ یا نادانستہ کی تفریق غیر ضروری ہوگی۔ تنظیموں، اداروں اور جماعتوں کو صرف غفلت یا ہوس اقتدار کے باعث جو نقصان پہنچتا ہے وہ دراصل نتائج کو دیکھتے ہوئے اس جرم سے بہت زیادہ سنگین ہوتا ہے جو افراد سے اپنی نجی زندگی میں سرزد ہوگیا ہو۔ ان جرائم کا پلہ جن کے اثرات کسی فرد تک محدود رہتے ہیں، سماج کو نقصان پہنچانے والے جرائم کا پلہ، جن کے اثرات کسی فرد تک محدود رہتے ہیں، سماج کو نقصان پہنچانے والے جرائم یا غفلتوں کے مقابلے میں بہت ہلکا ہوتا ہے۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے اداروں اور وقیع تنظیموں میں سربراہ کی غفلت، خودغرضی، غیر ذمے داری کی وجہ سے شگاف پڑ جاتا ہے جسے وقت اور سعی ازالہ بھر نہیں پاتا۔ ان تنظیموں پر نظر ڈالئے، اضلاع میں امن و امان قائم رکھنے والی مشینری، ریاستوں میں اطلاعات اور ارتقا کا نظام، یونیورسٹیوں اور دوسرے تعلیمی اداروں کا اہتمام، تجارتی اور صنعتی کمپنیوں کا نظم۔ ان سب میں اکثر کسی فرد کی غفلت اور غیر ذمے داری سے خلل رونما ہوتا ہے۔ بڑے پیمانے پر خلل برپا کرنے والے، سول سوسائٹی کا بہت بڑا نقصان کرتے ہیں، ان کی غفلت انسانیت اور تہذیب کو جراحت پہنچاتی ہے لیکن ان کے قصور کے لیے سماج ان سے باز پرس نہیں کرتا۔ اس لیے لغزشوں اور بے اعتنائیوں کا بازار گرم رہتا ہے۔ جتنی جلد اجتماعی طور پر نقصان رساں فروگزاشتوں کو جرائم کی فہرست میں شامل کرلیا جائے، انسانی تہذیب کے لیے فائدہ مند ہوگا۔

اس دور میں جب انسانوں کا ایک دوسرے پر انحصار بہت بڑھ گیا ہے اور جب تنظیم در تنظیم کے سلسلے نے آفاقی سرحدیں چھو لی ہیں، اور جب تفتیش و احتساب نے عالمگیر حیثیت اختیار کرلی ہے، سماج کو نقصان پہنچانے والی کوتاہیوں کی جواب دہی کو اس کا وہ مقام ملنا چاہیے جو سول سوسائٹی کی صحت اور بقا کے لیے ضروری ہے۔ سول سوسائٹی مطالبہ کرتی ہے کہ آداب و اقدار و قواعد سے جہاں انحراف ہو انسانیت کے خیر خواہ افراد کمال جرأت سے صدائے احتجاج بلند کریں۔ آپ نے دیکھا گواسکر نے بالترتیب کرکٹ کے کھلاڑیوں منتظموں اور نگرانوں کی دریدہ دہنی اور غفلت کے خلاف ہمت اور اصابت کے ساتھ آواز اٹھائی۔ ایسے وقت میں آواز اٹھائی جب کرکٹ کے شائقین کو سیلاب غیض و غضب اور جانبداری کا طوفان بہا کر لے گیا تھا۔ اور نام نہاد حب الوطنی نے تمیز نیک و بد کو دھندلا دیا تھا۔ اس بیان کا اثر کچھ نہ کچھ ہوکر رہے گا۔ کرکٹ کے ایوان میں یوں تو بدعنوانیوں کی بھرمار ہے لیکن احتجاج کی شروعات کہیں سے تو ہوئی تھی۔ معاشرہ کا عام طور پر یہ حال ہے کہ ایک فرد کی غفلت سے ہونے والے حادثوں پر دارو گیر تو ہوتی رہی ہے لیکن فرد کی غفلت، اور نالائقی سے سماج یا اس کے کسی جزو کو جو غیر محسوس یا دور رس نقصان پہنچ جاتا ہے اس کی باز پرس نہیں ہوتی۔ باز پرس کے لیے درکار ہوگا اجتماعی امور پر سول سوسائٹی کی طرف سے چوکنا پن اور چوبیس گھنٹے کا احتساب، وہ احتساب جس کی کوکھ سے ذمے داری کا احساس جنم لیتا ہے۔ انسانی معاشرہ انصاف وار جواب دہی کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور ان دونوں کو سرسبز وشاداب رکھنے کے لیے درکار ہوتی ہے فکر اور اظہار کی آزادی۔ اور بغیر جرأت کے نہ فکر آزاد رہ سکتی ہے نہ اظہار کی صلاحیت۔ معاشرہ تہذیب کو پروان چڑھاتا ہے افراد کو عافیت اور سکون اور امن و امان فراہم کرتا

ہے اور اس کے عوض افراد سے انصاف پسندی اور حق گوئی کا مطالبہ کرتا ہے۔ ان غلطیوں سے چشم پوشی کرنا جو معاشرہ کو نقصان پہنچاتی ہیں، جراحت رسانی کے اس عمل میں شرکت کے مساوی ہوتا ہے۔ ثواب صرف جابر حاکم کے روبرو کلمۂ حق ادا کرنے میں نہیں ملتا۔ حالانکہ اس کا بہت بڑا، بہت ہی بڑا اجر ہے۔ جمہوریت کے دور میں بگڑے ہوئے معاشرے کے حضور وہ سچ بات کہہ دینا بھی جو کڑوی اور جرأت طلب ہو کارِ ثواب ہے۔ پہلے سابقہ ایک جابر حاکم سے ہوتا تھا اب سابقہ ان سیکڑوں انسانوں سے ہوتا ہے جو صاحب اقتدار و اثر ہوتے ہیں اور غرض جن کو اندھا کر دیتی ہے اور کلمۂ حق سے جن کو بیر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تعلیمی اداروں کو لیجیے جن میں سے بہت سے اساتذہ نااہلی کی سیڑھیوں پر نظام باطل کی مدد سے چڑھتے چلے جاتے ہیں، وہاں صلاحیت کی رٹ لگانا اور اسے سفارش اور دباؤ اور چاپلوسی کی جگہ مسند نشین کرنا ان بگڑے ہوئے حالات میں ایک بہت پُرخطر مہم ہوگی۔ اساتذہ سے بازپُرس کی ہمت وہاں کسے ہوگی اور غلط تقررات کی راہ میں حائل ہونے کے لیے جگر کہاں سے آئے گا۔ تعلیم کے میدان سے آگے بڑھیے، عام دفاتر کو لیجیے۔ اس کا یارا بہت کم مامورین کو ہوگا کہ اپنے ماتحتوں کا نامۂ اعمال حقیقت کے عین مطابق لکھ دیں۔ عافیت اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ انھیں استحقاق کے بغیر ستائشی کلمات اور تحسینوں سے نوازا جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اہل اور نااہل ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں اور ترقی کرنے کے لیے محنت اور دیانت اور صلاحیت مدِ فضول بن جاتے ہیں۔ نالائقوں کو اچھے خاصے ریمارک دینے والوں کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ وہ اس بے جا فیاضی کے ہاتھوں لیاقت کا اور ادارہ کی اجتماعی کارگزاری کا خون کر رہے ہیں۔ کسی ادارے یا روایت، یا نظام، کو جراحت پہنچانا اپنے نتائج میں افراد کا خون کرنے سے کہیں زیادہ نقصان پہنچانے والا عمل ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اجتماعی نفع و نقصان کی بابت ہمارا حس کند اور احساسِ ذمے داری مفلوج ہوگیا ہے۔ فرد کی غفلت سے سماج کو طرح طرح سے نقصان پہنچتے ہیں۔ سامنے کی ایک مثال پولیو کو لیجیے، ایک عالمگیر کوشش کی جارہی ہے اسے بچپن میں مقررہ ایام میں متعینہ خوراک پلا کر ختم کرنے کی۔ اس کوشش میں اگر سارا ملک اور ساری انسانیت شریک نہیں ہوتی، ایک فرد بھی اگر اس دائرے کے باہر رہ جاتا ہے تو سارے ملک اور ساری انسانیت کی کوششیں اکارت ہوجاتی ہیں۔ آپ نے دیکھا انسانیت باہم کس طرح گتھی ہوئی ہے اور حق العباد کا دائرہ کتنا وسیع ہوگیا ہے، اس کی جہات ناپیدا کنار ہوگئی ہیں۔ فارسی شاعر نے کہا تھا:

خاک راہے کہ براں می گزری ساکن باش
کہ عیون است و جفون است و خدود است و قدود

(جس راہ پر تم چلتے چلے جارہے ہو، ذرا دیر کے لیے اس پر رُک کر غور تو کرو کہ تمھارے پیروں کے نیچے صد ہا آنکھیں ہیں، ٹھڈیاں ہیں، رخسار ہیں اور قامتیں ہیں)۔ اس نے تو ہمیں "چتاونی" یا تنبیہ دی تھی کہ ہمارے قدموں کے تلے ایک دنیا ان لوگوں کی آباد ہے جو کبھی ہمارے جیسے تھے۔ ہمیں ان کا احترام لازم ہے۔

اردو کے ایک شاعر نے اسی خیال کو ایک دوسرا رخ دے دیا:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

غور کیجیے ہماری ذمے داری جب دنیا سے گزر جانے والوں کے تئیں اس قدر ہے تو ان لوگوں کے تئیں کتنی ہوگی جو جیتے جاگتے ہیں۔ سانس لے رہے ہیں، اور بے شمار پہلوؤں سے ایک دوسرے پر اثر انداز ہورہے ہیں، ایک دوسرے سے اثر لے رہے ہیں۔ جس زاویے سے دیکھیے انسانیت کی فلاح منحصر نظر آتی ہے اس کے تئیں افراد کی بیداری اور ذمے داری پر۔ معاشرے کی فلاح کو اگر ہم نظر انداز کرتے ہیں، معاشرے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں تو ہماری یہ چشم پوشی، ہمارا وہ فائدہ پہلے ہمارے سماج کو مجروح کرے گا اور پھر خود ہمیں۔ ہم اگر ان محصولات اور واجبات کے ادا کرنے میں آنا کانی کرتے ہیں جو مرکزی، ریاستی اور مقامی حکومتیں ہم پر خدمات کے عوض عائد کرتی ہیں تو نقصان بالآخر ہمارا اور صرف ہمارا ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے گردونواح کو صاف اور پُرسکون نہیں رکھتے تو بھی نقصان ہمارا ہی ہوگا۔ اجتماعی مسئولیت سے کنارا کشی اپنی قبر خود کھودنے کے مترادف ہوتی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی چالاکیوں سے احتراز لازم ہے جو ہم عارضی اور ظاہری انفرادی نفع کے لیے کر بیٹھتے ہیں۔ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ برائی کو دیکھ کر برائی جڑ پکڑتی ہے۔ شیخ شیراز نے کہا تھا:

"بنیادِ ظلم در جہاں اندک بود ہر کہ آمد براں مزید کرد"

(جہاں میں پہلے ظلم اور ناانصافی بہت کم تھی جیسے جیسے لوگ آتے گئے اس پر اضافہ ہوتا گیا)

ہمیں چاہیے کہ اپنا احتساب کرتے رہیں تاکہ ظلم اور ناانصافی میں ہمارے ہاتھوں اضافہ نہ ہو پائے۔ ہم اقران و امثال کے لیے غلط مثال نہ بنیں۔ شدید ضرورت ہے فرد کے اجتماعی شعور کو بیدار کرنے کی اور معاشرہ سوز لغزشوں کی سنگینی کو آشکار کرنے کی، مسئولیت کا سبق دہرانے کی اور برائی کو شروع میں ہی دبا دینے کی۔ گواسکر کا جرأت آموز بیان ہمیں یہی سکھاتا ہے۔

راقم سطور پایانِ گفتگو میں قارئین کرام سے اپیل کرے گا کہ جو موضوع اس نے گواسکر کے بیان کے زیر سایہ آج چھیڑا ہے اس پر بحث اور استدلال کا دروازہ کھول دیں۔

(بہ شکریہ۔ روزنامہ "قومی آواز" نئی دہلی)

□□□

وقار صدیقی

موگھیا قبائلی رسم و رواج

ہمارے ملک میں چار سو سے زائد قبائل ہیں، انھیں ایک زمرے میں شامل نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ان کے اختلافات اور تضادات کی فہرست بہت لمبی ہے۔ بہت سے قبائل ایسے ہیں جو بنجاروں کی طرح زندگی گزارتے ہوئے ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں۔ ان میں نٹ، کنجر، قلندر، سانسی، بادھری، مینا، بدک، بھانتو، باوریا، سنوریا، بجوریا، بیاٹ، بیڑھیا، چیرمنگتا، لنگی پٹھان کربل، صیقل گر، وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ قبائل بندر یا ریچھ کا ناچ دکھاتے ہیں تو کچھ بھیڑ، بکری، گائے وغیرہ چرانے کا کام کرتے ہیں۔ کچھ جڑی بوٹیوں کا کاروبار کرتے ہیں، تو کچھ گیت گا کر بھیک مانگتے ہیں۔ ان کی عورتیں رسّی بنانے، ٹوکری اور چٹائی وغیرہ بننے کا کام کرتی ہیں۔

یہ لوگ ریلوے اسٹیشنوں، بس اسٹینڈوں، یا بڑے میدانوں کے قریب جہاں پانی کی سہولت مہیا ہوتی ہے، اپنے ڈیرے لگا لیتے ہیں، کچھ عرصے تک وہاں رک کر کام کرتے ہیں اور جیسے ہی ان کے قبیلے کے سردار کا حکم ہوتا ہے یہ اپنے خیموں کو باندھ کر، گدھوں یا بیل گاڑیوں پر سامان لاد کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے اور اسی طرح جگہ جگہ بھٹکتے ہوئے بیت جاتی ہے۔ آج کل یہ لوگ ریل گاڑیوں اور بسوں کا بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ ان کے یہاں پیدائش، موت، شادی وغیرہ جیسے اہم واقعات بھی سفر کے دوران ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

برطانوی حکومت خانہ بدوش قبائل کو اس قدر خطرناک سمجھتی تھی کہ اس نے 1871 میں جرائم پیشہ ذاتوں سے متعلق قانون سازی کر کے خانہ بدوش قبائل کے جرائم پیشہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور فطرت کی ان لاڈلی اولادوں پر کئی قسم کی پابندیاں اور بندشیں عائد کر کے ان کی زندگی کو وبالِ جان بنا دیا تھا۔ حصولِ آزادی کے بعد 1952 میں جرائم پیشہ اور قانون کو ختم کر دیا گیا۔ تبھی سے یہ خانہ بدوش قبائل، آزاد قبائل کہلانے لگے۔

موگھیا بھی ایک سابق جرائم پیشہ خانہ بدوش قبیلہ (ذات) ہے۔ اسے مونگہ اور موگھی ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اتر پردیش میں موگھیوں کو بھیلیا کہا جاتا ہے۔ موگھیا لوگ بنگال، بہار، اڑیسہ، راجستھان، اتر پردیش اور مدھیہ پردیش میں بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ خانہ بدوش ہونے کی وجہ سے ان کی صحیح تعداد معلوم کرنا بڑا مشکل کام ہے۔

موگھیوں کی ابتدا کس طرح اور کب ہوئی اس بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایک روایت یہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ اندر دیوتا اپنے شکاری بھیلیا کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ انھیں بڑی بھوک لگ رہی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہے تھے، تبھی انھیں دور سے بھیلیا آتا دکھائی دیا۔ اس کے کاندھے پر ایک ہرن لدا ہوا تھا۔ بھیلیے نے ہرن لاکر اندر دیوتا کے سامنے رکھ دیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ آج وہ کچھ خوفزدہ نظر آ رہا تھا اور اندر سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ اندر دیوتا نے بھیلیے سے اس کا سبب پوچھا تو وہ اور بھی خوفزدہ ہو گیا۔ گھبراہٹ کی وجہ سے اسے کوئی جواب نہیں سوجھا۔ اندر کو شک ہوا۔ انھوں نے اپنی غیبی طاقت سے ساری اصلیت معلوم کر لی۔ سورگ کا رہنے والا بھیلیا ہرن کے تھوڑے سے گوشت کے لالچ میں گمراہ ہو جائے گا۔ اس کی انھیں قطعی امید نہ تھی۔ اندر دیوتا غضب ناک ہو اٹھے۔ انھوں نے بھیلیے کو بددعا دی کہ وہ ایک ہرن پر ریجھ گیا، اس لیے وہ سال میں صرف ایک ہی ہرن کا شکار کر پائے گا۔ اندر نے بھیلیے کو بددعا دے کر سورگ سے باہر نکال دیا۔ بھیلیا زمین پر آ گیا۔ وہ ہرن کے گوشت پر موہت ہو گیا، اس لیے اس کے وارث موگھیا کہلائے۔

موگھیا خاص طور سے دیسی جڑی بوٹیوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ یہ لوگ کاندھوں پر تھیلا لٹکائے گھومتے ہوئے یا بڑے بڑے شہروں میں سڑکوں کے کنارے دکان لگا کر دیسی جڑی بوٹیاں بیچتے دیکھے جاسکتے ہیں۔ عموماً یہ طاقت بخش دوائیں فروخت کرتے ہیں نیز خود کو شلا جیت والا کہلانا پسند کرتے ہیں۔ جنگلوں میں رہنے کی وجہ سے دیسی جڑی بوٹیوں سے متعلق ان کی واقفیت بڑی وسیع اور حقیقت پر مبنی ہوتی ہے لیکن ان کا طرزِ علاج روایتی ہے۔ موگھیوں کے آباو اجداد دیسی جڑی بوٹیوں اور دواؤں کا بیوپار کرنے کے لیے تھائی لینڈ، بنکاک، شری لنکا جاوا، ساترا وغیرہ ملکوں میں بھی جایا کرتے تھے۔ تھائی لینڈ میں بہت سے موگھیا خاندان مستقل طور پر آباد ہو گئے ہیں اور اب بھی وہ دیسی جڑی بوٹیوں کا کاروبار کر رہے ہیں۔

موگھیا بڑے ماہر شکاری ہوتے ہیں۔ ان کی عورتیں بھی شکار پر جاتی ہیں۔ عموماً دو سے پندرہ لوگ تک شکار کے لیے نکل پڑتے ہیں، اور جال، پنجرہ مراسی، کھندارو، لڑکا وغیرہ کے ذریعے عام پرندوں سے لے کر شیر تک کا شکار کر لیتے ہیں۔ شکار کے لیے یہ کبھی مچان نہیں بناتے۔ موگھیوں کا سب سے مقبول شکار جنگلی سور ہے، جس کا شکار زمین میں گڈھے بنا کر بندوق سے یا بارود کے گولے سے کیا جاتا ہے۔

موگھیا سماج میں ایسی بہت سی عجیب و غریب رسمیں ہیں، جن سے مہذب سماج آج تک واقف نہیں۔ 'الاک' یعنی ناپاکی ایسا ہی عجیب و غریب اندھا عقیدہ ہے۔ یوں تو موگھیوں میں عورتوں کی سماجی حیثیت مردوں کے برابر ہے۔ ان میں لڑکی کی پیدائش کو فال نیک سمجھا جاتا ہے، لیکن موگھیوں میں شادی شدہ عورتوں کے لہنگے یا گھاگرے کو سب سے زیادہ ناپاک سمجھا جاتا ہے۔ اس کے چھو جانے سے چیزیں ناپاک ہو جاتی ہیں۔ موگھیا عورتیں اپنا لہنگا دھو کر کانٹے دار جھاڑیوں یا پتھروں پر سکھاتی ہیں۔ اگر کوئی شادی شدہ موگھیا عورت اپنا نیا یا پرانا، میلا یا دھلا کیسا بھی لہنگا اپنے ڈیرے، کچے یا پکے مکان کی دیوار پر ڈال دے تو وہ دیوار نجس ہو جائے گی اور اسے توڑنا پڑے گا۔ اتنا ہی نہیں، بندوق، کاغذ، روپیہ پیسہ اور سونا چاندی کے علاوہ گھر کی سبھی چیزیں ناپاک ہو جائیں گی اور انھیں پھینکنا پڑے گا۔ اسی دن پنچایت بٹھائی جائے گی اور خاندان کے سبھی افراد کو ذات برادری سے خارج کر دیا جائے گا۔ ذات سے معطل شدہ موگھیا خاندان کو دوبارہ ذات میں شامل ہونے کے لیے اپنا مکان توڑنا پڑے گا اور گھر کے سب افراد کو تین مقامات ہردوار، الہ آباد اور بنارس میں گنگا اشنان کرنا ہوگا نیز پوری برادری کو کھانا کھلانا پڑے گا۔ اس عمل کے بعد اس خاندان کو برادری میں شامل کیا جا سکتا ہے، لیکن اسے ہمیشہ کے لیے داغدار کنبہ کہا جائے گا۔ داغدار کنبوں کے لوگوں کی حیثیت عام لوگوں سے کمتر سمجھی جاتی ہے۔ یہ لوگ کبھی پنچ یا مکھیا نہیں بن سکتے۔

موگھیوں میں کردار کشی کو قتل سے بھی زیادہ گمبھیر جرم سمجھا جاتا ہے۔ عام طور سے خراب کردار کا شخص خود ہی اپنا جرم قبول کر لیتا ہے لیکن اگر وہ جھوٹ بولتا ہے تو اسے مختلف دیوی دیوتاؤں کی قسمیں کھانی پڑتی ہیں۔ دیوی دیوتاؤں کی بددعاؤں سے خوف زدہ رہنے والے موگھیا کبھی جھوٹی قسم نہیں کھاتے۔ قسم کھانے سے قبل ہی سچائی سامنے آجاتی ہے۔ تاہم کبھی کبھی کچھ لوگ اپنے جرم کو چھپانے کے لیے اخیر تک جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ ایسی صورت حال کے پیدا ہونے پر انھیں خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے پانی یا آگ کی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ موگھیوں میں اگنی پریکشا کا چلن آج بھی ہے۔

موگھیوں کی بڑی مضبوط اور طاقتور تنظیم کا نام "پنچایت" ہے۔ یہ لوگ معمولی لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ سے قتل تک کے تنازعوں کا تصفیہ اپنی قبائلی پنچایت میں ہی کر لیتے ہیں۔ ان کے یہاں کسی بھی معاملے میں پولس کی امداد لینا یا پولس کی مدد کرنا بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ عام طور سے کسی بھی قسم کا کوئی تنازعہ پیدا ہونے پر دونوں فریقوں کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور شہر، گاؤں یا بستی کے باہر پنچایت منعقد کی جاتی ہے۔ پنچوں کی فیس اور جرمانے کی رقم دونوں فریقوں سے شروع ہی میں وصول کر لی جاتی ہے۔ موگھیا پنچایت میں چور کو چور یا بے ایمان کو بے ایمان نہیں کہا جا سکتا بلکہ سب سے پہلے مدعی کا ایک پنچ ہوا، پانی، جنگل، جانور، پرند، راجا، رانی وغیرہ کے بالواسطہ حوالے سے الزام عائد کرتا ہے۔ اسی وقت مدعا علیہ کا کوئی پنچ اٹھتا ہے اور وہ بھی کہانی یا لوک کتھا سنا کر اپنی صفائی پیش کرتا ہے۔ انھی کہانیوں کی بنیاد پر مکھیا پنچ سبھی پنچوں کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سناتا ہے۔ موگھیا پنچایت ہمیشہ اتفاق رائے سے فیصلہ کرتی ہے اور اسے دونوں فریق بخوشی منظور کر لیتے ہیں۔

اس لیے موگھیا سماج میں لوک کتھاؤں کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے یہاں دو قسم کی لوک کتھائیں رائج ہیں۔ پہلی قسم قبائل سے متعلق انصاف پسند پنچایت کی لوک کتھاؤں کی ہے اور دوسری وہ لوک کتھائیں جو بچوں کو رات میں سوتے وقت سنائی جاتی ہیں۔ پہلی قسم کی لوک کتھاؤں میں اخلاقی قدروں کی عظمت کا بیان ہوتا ہے جبکہ دوسری قسم کی لوک کتھائیں علم میں اضافہ کرنے والی ہوتی ہیں۔

بھارت میں تعلیم کے فروغ، ذرائع آمد و رفت، ذرائع ابلاغ، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور جمہوری نظام کے پھیلاؤ کا موگھیوں پر بھی کافی اثر ہوا ہے۔ اب یہ لوگ سال میں تقریباً چار ماہ ایک جگہ پر بس کر رہنے لگے ہیں، اور انھوں نے اپنے بچوں کو اسکول بھی بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنا آبائی پیشہ ترک کر کے سرکاری ملازمت کر لی ہے یا پھر دوسرے پیشے اختیار کر لیے ہیں۔ مدھیہ پردیش میں پنچایتی نظام کے تحت اب موگھیے بھی پنچ اور سرپنچ چنے جانے لگے ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی میں ایک واضح تبدیلی آئی ہے لیکن مجموعی طور پر یہ اب بھی پسماندہ ہیں اور غریبی اور بدحالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

□□□

پتہ:
Garhway Ki Ghot, Hakim Sahab Ka Bara,
Lashkar, Gwalior (M.P.)

محمد خلیل

آلودگی اور درپیش مسائل

انسانی تہذیب کے آغاز سے ہی ہمارا ماحول آلودگی پذیر رہا ہے اور وقت کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ خاص طور پر مشینی اور تکنیکی ترقی کے باعث اس میں اور اضافہ ہوا ہے۔ ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ہوا، پانی اور مٹی اس قدرتی نظام کا ایک حصہ ہیں جو حیوانی اور نباتاتی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ زندگی کی تمام قوتیں قدرتی توازن کے ساتھ باہمی طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ اگر اس میں کسی طرح کی دخل اندازی کی جائے تو یہ توازن بگڑ سکتا ہے اور انسانی زندگی خطرات سے دوچار ہو سکتی ہے۔

آج جب ہماری پہنچ خلا تک ہے، فضائی آلودگی ہمارے لیے ایک لاینحل مسئلہ بن گئی ہے۔ اور نسلِ انسانی کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر صنعتی کارخانوں سے دھواں نکالتی ہوئی چمنیاں ہوں یا جہاز اور پٹرول سے چلنے والی موٹریں سبھی ہوا کو آلودہ کر رہی ہیں۔ آلودگی صرف ہوا تک ہی محدود نہیں ہے یہ پانی اور زمین پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں سیکڑوں حیوانات، نباتات ختم ہو چکے ہیں اور متعدد فنا کے دہانے پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ صنعتی ارتقا کے ساتھ ہی آلودگی بھی وجود میں آتی ہے۔ آج کا انسان نہ صرف زہریلی ہوا میں سانس لے رہا ہے بلکہ آلودہ پانی اور متعدد زہریلی چیزوں کا استعمال کر رہا ہے اور نتیجتاً مختلف بیماریوں کا شکار ہو رہا ہے۔

ہوا کی آلودگی

ہوا کو گندہ کرنے کا ذمے دار کافی حد تک خود انسان ہے۔ پٹرول اور ایندھن کے دوسرے ذرائع فضا میں آلودہ گیسوں کی مقدار میں تیزی سے اضافہ کر رہے ہیں۔ کوئلے کا استعمال عام ہو چکا ہے۔ ہماری فضا میں نقصان دہ گیسیں بادل کی شکل میں موجود ہیں اور کتنے ہی لوگ گذشتہ دہائی میں آلودہ اور زہریلے دھوئیں سے موت کا شکار ہوئے ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق بیسویں صدی کے دوران ڈیزل اور پٹرول کے بڑھتے ہوئے استعمال سے تقریباً سات سو کروڑ ٹن زہریلے مادے دھوئیں کی شکل میں ہوا میں تحلیل ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ موٹروں اور انجنوں کے دھوئیں اور ڈیزل سے پہلے چلنے والی مشینوں کے دھوئیں نے آلودگی کو بڑھا دیا ہے۔ فضا کے اندر جو زہریلی گیسیں ہیں ان میں کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2)، کاربن مانو آکسائیڈ (CO)، سلفر ڈائی آکسائیڈ، نائٹروجن آکسائیڈ سب سے زیادہ مہلک ہوتی ہیں اور انسان کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ اگر ہم فضا کی آلودگی کا ملکی سطح پر جائزہ لیں تو شہر کولکاتا میں ایک تحقیقی جائزے کے مطابق چھ ہزار سے زائد کارخانے اور بڑی تعداد میں موجود موٹر گاڑیاں ہر روز سات سو ٹن سے زائد زہریلی گیس ہوا میں داخل کرتی ہیں۔ اس زہریلی ہوا میں سیسے کے ذرات بھی شامل ہوتے ہیں جو ہماری صحت کے لیے بیحد مضر ہیں۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے غذائی پیداوار کو بڑھانے کی ضرورت پیش آئی جس کے لیے کئی طرح کی کیمیاوی کھادوں کا استعمال بڑے پیمانے پر کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں فاسفیٹس بنانے والے کارخانوں کے ذریعے فاسفین اور فلورین گیسیں کارخانوں سے نکل کر ہوا میں پہنچیں جو فصلوں اور نباتات نیز جانوروں کے لیے بھی ضرر رساں ہیں۔ عالمی سطح پر ہر سال تقریباً پانچ سو سے زائد کیمیائی مرکب استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ یہ عمل ایک عرصے سے مسلسل جاری ہے جس سے ہوا کی آلودگی کو ختم کر کے ہوا کو صاف کرنا ناممکن سا ہو گیا ہے۔ ہمارے ملک میں ہوا کو آلودہ کرنے میں گرد و غبار بھی کچھ کم کردار ادا نہیں کر رہے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ایک مربع کلومیٹر کے حدود میں پھیلی ہوئی گرد و غبار کی مقدار تقریباً 35 ٹن تک ہے جبکہ یہ مقدار صنعتی علاقوں میں اور زیادہ ہوتی ہے جس سے لوگ ناک، کان، گلے اور پھیپھڑوں کی کئی قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ فضائی آلودگی سے انسان ہی نہیں بلکہ پتھر بھی متاثر ہوتے ہیں۔ تاج محل کو متھرا کی تیل صاف کرنے والی فیکٹری کی ہوائی آلودگی سے خاصا نقصان پہنچا ہے۔ کشمیر کی خوبصورت ڈل جھیل کے پانی میں بھی زہریلے اجزا کی مقدار بڑھ گئی ہے۔ قدرتی نظام کے مطابق ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کا تناسب بڑھتا نہیں کیونکہ کاربن ڈائی آکسائیڈ سے پودے سورج کی روشنی میں اپنی غذا بناتے ہیں۔ پودے فضا میں تقریباً 70 فیصد آکسیجن فراہم کرتے ہیں اور پیڑ پودے ختم ہوتے رہے تو انسان کا سانس لینا بھی مشکل ہو جائے گا۔ دوسری طرف ہماری زمین مسلسل گرم ہو رہی ہے کیونکہ بجلی کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ جس سے قطب جنوبی کی برف پگھلنے میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ جس سے زمین کے کچھ حصوں کے غرق ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

پانی کی آلودگی بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ عالمی سطح پر زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس طرح قدرت نے ہمارے لیے پانی محفوظ کر دیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 37 ہزار مربع کلومیٹر پانی ابخرات کی شکل میں ہوا میں مل جاتا ہے اور بعد میں یہی پانی بارش کی شکل میں زمین پر برستا ہے۔ گندہ پانی دریاؤں کے ذریعے سمندر تک پہنچ جاتا ہے۔ شہروں کی گندگی، فضلات پانی کے ذریعے بہہ کر دریاؤں تک پہنچتے ہیں جس سے دریاؤں کا پانی

بے حد گندہ اور زہریلا ہوتا جارہا ہے۔ پینے کا پانی آلودہ ہو تو اس سے متعدد بیماریاں مثلاً کالرہ، پیچش، ٹائیفائیڈ جیسی مہلک بیماریاں پھیلتی ہیں۔ ہمارے ملک میں ایک بڑی آبادی دریاؤں کے کنارے بستی ہے اور ان دریاؤں میں بڑی مقدار میں کیمیائی اجزاء، جراثیم کش دوائیں، فضلات اور آلودگی پیدا کرنے والی دوسری چیزیں بہہ کر پہنچتی رہتی ہیں جو پانی کو آلودہ کرتی ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق امریکہ کی بائیس ندیوں کا پانی آئندہ آنے والی صدی میں اس قابل نہیں رہے گا کہ کسی جاندار مچھلی کی پرورش کر سکے۔ ہمارے ملک میں بھی آئندہ تیس چالیس برسوں میں غالباً یہی صورت حال ہو جائے گی۔

اب زمینی آلودگی کو لیجیے بڑھتی ہوئی آبادی سے ایک طرف زمین کم ہوتی جارہی ہے جس سے کاشتکاری پر برا اثر پڑا ہے، دوسری طرف مٹی کی طاقت بھی ختم ہورہی ہے۔ صنعتی کارخانے مسلسل کھلتے جارہے ہیں جن سے جنگلات کم ہو رہے ہیں۔ انسان ابتدا سے ہی زمین پر صحت مند زندگی گزارنے کی کوشش کرتا رہا ہے لیکن وہی زمین پر آلودگی پھیلانے کا سب سے زیادہ ذمے دار ہے۔ گذشتہ کئی دہائیوں سے انسان گھر کا کوڑا کرکٹ اور بیکار اشیا اس طرح زمین پر پھینکنے لگا ہے کہ یہ خود اس کی زندگی کے لیے خطرہ بن گئی ہیں۔ کوڑا کرکٹ سبزیوں کے ٹکڑے، پالی تھین کے تھیلے، پرانے کپڑے اور اس طرح کی دوسری گندگی زمین کو آلودہ کررہی ہے۔

شور کی فضائی آلودگی بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ ہم بھلے ہی اس کا احساس نہ کریں لیکن فضا کا شور ہمارے اعصاب پر زبردست وار کرتا ہے۔ یہ آلودگی کسی طرح بھی ہو، پانی یا دوسری آلودگی سے کم خطرناک نہیں ہے۔ شور کی وجہ سے خون کے خلیوں انگلیوں، پیروں کے انگوٹھوں اور جلد کے کچھ حصوں پر برا اثر پڑتا ہے۔ شور آنکھوں کی باریک نسوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور پتلی میں پھیلاؤ شروع ہو جاتا ہے جس سے بینائی کم ہونے کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

ماحول کی آلودگی سے بچانے کے لیے مختلف قسم کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ بجلی گھروں میں ایسے آلات لگائے گئے ہیں جن کے ذریعے راکھ کو چمنی سے نکلنے سے پہلے ہی علاحدہ کر دیا جاتا ہے۔ اس راکھ کو تعمیر میں استعمال ہونے والی اینٹیں بنانے میں استعمال کیا جارہا ہے۔ ندیوں میں آلودگی کو روکنے کے لیے کئی اہم قدم اٹھائے گئے ہیں۔ زیادہ تر موٹر گاڑیوں میں پیٹرول کی جگہ اب سی این جی گیس کا استعمال ہو رہا ہے جس سے فضائی آلودگی کم ہوئی ہے۔ کیڑے مار دواؤں کے استعمال پر اب بڑی توجہ دی جارہی ہے کیونکہ یہ زمین سے چل کر پیڑ پودوں تک پہنچ جاتے ہیں اور فصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسان جب غذائی طور پر ان چیزوں کا استعمال کرتا ہے تو وہ انسان کے جسم میں پہنچ جاتے ہیں اور نقصان پہنچاتے ہیں۔ آلودگی کو ختم کرنے میں سی۔ایس۔آئی۔آر۔ کے ایک مرکز انڈسٹریل ٹیکنالوجی ریسرچ سنٹر لکھنؤ نے کافی کام کیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ماحول کی آلودگی کے سلسلے میں عام لوگوں کو واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ ہمارے سائنس داں اس عالمی مسئلے سے باخبر ہیں اور اس سلسلے میں قومی تجربہ گاہوں میں تحقیق جاری ہے جس کے نتائج سے مستقبل میں آلودگی کو کم کرنے میں مدد ملے گی۔ یہ ایک جگہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ساری دنیا آلودگی کے مسئلے سے دوچار ہے۔ اس طرح سب کو اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے توجہ کرنی ہوگی۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہر شخص یہ تسلیم کرلے کہ صحت مند ماحول، صاف ہوا، صاف پانی اور غیر آلودہ فضا بھی ہمارے لیے اسی قدر ضروری ہے جس قدر زندگی کے دوسرے لوازمات جنھیں ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

□□□

پتہ:
H51, DR Iqbal Lane, Batla House,
Jamia Nagar, New Delhi-110025

مسدود راہیں

ترجمہ و تعارف — زاہدہ زیدی

''مسدود راہیں'' میں پانچ اہم ترین جدید مغربی ڈراموں کا ترجمہ و تعارف زاہدہ زیدی نے پیش کیا ہے۔ زندگی اور موت، تلاش ذات، عرفان کائنات، تنہائی اور مابعد الطبیعیاتی خلا، انسانی صورت حال، لامحدود کائنات میں انسان کا مقام اور معنی کی تلاش جیسے گہرے اور بنیادی مسائل پر مبنی یہ ڈرامے فنی ندرت اور گہری معنویت کے باوصف جدید مغربی ڈراموں میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان ڈراموں کا تعلق بیسویں صدی کے وسط میں ابھرنے والی ایک ایسی ڈرامائی تحریک یا اسلوب سے ہے جس نے جدید مغربی ڈرامے کو انقلاب آفریں تبدیلیوں سے روشناس کرایا اور ڈرامے کے وسیع تر امکانات کو بروئے کار لاکر وجودی تجربے کی گہرائی میں اترنے، لاشعوری کیفیات کو گرفت میں لانے اور ذہن انسانی کے اسرار و رموز کو منکشف کرنے کی کوشش کی۔

صفحات: 406، قیمت -/126 روپے

اقبال محی الدین

سائنس کی ترقی اور مائیکرو چپس

سائنسی ترقی نے ہر شعبۂ حیات کو متاثر کیا ہے۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی میں الیکٹرانکس کے شعبے کی ایک کلیدی حیثیت ہے۔ یہ شعبہ انجنی توانائی، مواصلات، دفاع، تعلیم، زراعت، مینوفیکچرنگ اور تفریح کے شعبوں کے علاوہ روزگار کے مواقع پیدا کرنے اور قومی ترجیحات کو پورا کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ الیکٹرانکس عالمی معیشت کے سب سے زیادہ ترقی کرتے ہوئے شعبوں میں سے ایک ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ آج کل انفارمیشن ٹیکنالوجی میں جو انقلاب دیکھنے میں آرہا ہے اسے دوسرے ''صنعتی انقلاب'' سے تعبیر کیا جارہا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم انفارمیشن ٹیکنالوجی کی تفصیل میں جائیں ہمیں سائنس کی ترقی کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔ سب سے پہلے ہم زراعتی ترقی کی بات کرتے ہیں جس کے فروغ میں سائنس کا اہم رول رہا ہے۔ آزادی کے بعد ملک میں ہمارے کسان باوجود اپنی تمام تر کوششوں کے اتنا بھی غلّہ پیدا نہیں کر پارہے تھے کہ ملک کی غذائی ضرورت پوری ہوسکے۔ اسی لیے ہمیں باہر کے ممالک سے غلّہ منگانا پڑتا تھا۔ جدید سائنسی طریقوں، مشینوں اور اوزاروں کی مدد سے اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجے میں 66-1965 میں اناج کی اتنی پیداوار ہوئی جو ہماری ضرورت سے بھی زائد تھی۔ اسی لیے اس کو ''ہرے انقلاب'' یا Green Revolution کا نام دیا گیا۔ پھلوں کے باغات بھی کافی بڑھے اور پھولوں اور سجاوٹی پودوں کی اَن گنت قسمیں تیار کی گئیں۔ بائیوٹیکنالوجی پر تحقیقی کام شروع ہوا۔ اور 1986 میں باقاعدہ طور پر بائیوٹیکنالوجی کا ادارہ دہلی میں قائم ہوا۔ اس تکنیک کی مدد سے پھولوں، پھلوں، سبزیوں اور اناج کی پیداوار عمدہ اور بہت زیادہ ہونے لگی۔ بائیوٹیکنالوجی کی مدد سے نیشنل ڈیری انسٹی ٹیوٹ، کرنال اور نیشنل ڈیولپمنٹ بورڈ، آنند میں جین کی منتقلی کا عمل ممکن ہوا۔ گایوں اور بھینسوں کے دودھ میں ایک سیزن کی پیداوار پانچ ہزار لیٹر تک پہنچ گئی جس کو ''سفید انقلاب'' یا White Revolution کا نام دیا گیا۔

مچھلی کی کُل پیداوار جو 1951 میں 27 ملین ٹن تھی، بڑھ کر 200 ملین ٹن ہوگئی۔ سائنس کی جدید تکنیک سے مچھلی کی پیداوار میں بہت اضافہ ہوا اور ایک ہیکٹیئر تالاب میں 10 ٹن تک مچھلی پیدا کیا جانا ممکن ہوگیا۔ اس طرح اس کو ''نیلا انقلاب'' یا Blue Revolution کا نام دیا گیا۔

معدنیات قدرت کا ایک قیمتی تحفہ ہیں اور ہماری زندگی کے لیے بیحد کارآمد۔ یہ تحفہ ہندوستان کو عطا کرنے میں قدرت نے بڑی فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں معدنیات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان معدنیات کو سائنسی طریقے سے استعمال کے قابل بنایا جاتا ہے۔ ہندوستان خوش قسمتی سے چند بنیادی معدنیات کا حامل ہے جن پر اس کی جدید صنعتوں کا دارومدار ہے۔ خام لوہا، لوہے اور اسٹیل کی صنعت کے لیے اہم خام مال ہے اور ہندوستان اعلیٰ قسم کے لوہے سے پوری طرح مالا مال ہے اس کے علاوہ یہاں کوئلہ، مینگنیز، ابرق، باکسائیٹ، تانبا، سونا، نمک، المنائیٹ، مونازائیٹ، زرکون، لائم اسٹون اور ڈولومائیٹ جیسی معدنیات پائی جاتی ہیں۔

بھاری انجینئرنگ اور مشینی صنعت نے بھی سائنس کی ترقی کے ساتھ ترقی کی ہے۔ اب ہندوستان میں چھوٹی بڑی ہر طرح کی مشینیں بننے لگی ہیں جو کپڑا، سیمنٹ، شکر، کاغذ اور کان کنی کی صنعتوں میں کام آرہی ہیں۔

نقل وحمل میں بھی سائنس کا بیش بہا تعاون رہا ہے۔ ریل کے ڈبّے اور انجن ہندوستان میں بننے لگے ہیں۔ بھاپ انجن، ڈیزل اور بجلی سے چلنے والے ریلوے انجن چترنجن میں بنائے جاتے ہیں۔ چھوٹی لائن کے انجن جمشید پور میں بنتے ہیں۔ چنئی کے قریب پیرم بور میں سواری گاڑی کے ڈبّے تیار کیے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں جہاز سازی کے چار بڑے کارخانے وشاکھا پٹنم، کولکاتا، ممبئی کے نزدیک مزگاؤں اور کوچین میں ہیں۔ مزگاؤں کے جہاز سازی کارخانے میں ہندوستانی بحری فوج کے لیے جنگی جہاز بنتے ہیں۔ یہاں مسافر بردار اور بار بردار جہاز بھی بنائے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں ہوائی جہاز کی صنعت ابھی حال ہی میں شروع ہوئی ہے۔ اس کے اہم مراکز ہیں بنگلور، کان پور، ناسک، حیدرآباد اور لکھنؤ۔

ہندوستان متعدد کیمیائی اشیا اور ادویات تیار کرتا ہے۔ اس صنعت کے پبلک سیکٹر میں حکومت نے کئی کارخانے قائم کیے ہیں۔ اینٹی بائیوٹک ادویات بنانے میں ملک خود کفیل ہو چکا ہے۔

پیٹروکیمیکل ایک نیا صنعتی میدان ہے جس میں ترقی کے بے انتہا امکانات ہیں۔ ہندوستان میں معدنی تیل سے متعدد چیزیں بنائی جاتی ہیں جو پلاسٹک، نائیلون، پولی ایسٹر اور مصنوعی ربر پر مشتمل ہیں۔ پیٹروکیمیکل کے بڑے کارخانے گجرات میں وَڈودرا (Vadodra) کے قریب اور مہاراشٹر میں

ممبئی کے قرب وجوار میں واقع ہیں۔

انسان کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ وہ چاند اور دوسرے سیاروں کو چھو لے۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ ہوائی جہاز اور ہیلی کوپٹر وغیرہ کے سہارے وہ آسمان کی بلندیوں کو چھوتا رہا ہے۔ مگر دن بہ دن اس کی بڑھتی ہوئی یہ خواہش کہ خلا میں کیا ہے؟ اور اس کے آگے بھی کیا ہے؟ اس خواہش نے سیٹلائٹ کو جنم دیا جس کے سہارے وہ چاند اور دوسرے سیاروں کی طرف بڑھنے لگا۔ چاند پر تو اس نے قدم بھی رکھ دیے اور مریخ کی طرف بھی گامزن ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی طرح انسان اپنی اَن تھک کاوشوں سے سائنسی ترقیات کو عملی جامہ پہناتا رہا اور نہ صرف زمین کا ہی فاتح بنا بلکہ خلا کا بھی فاتح بن گیا۔ اس کی اس فتح میں سائنس کا بہت اہم کردار رہا ہے۔

ہندوستان کا خلائی پروگرام نومبر 1963 میں شروع ہوا۔ اس کا سہرا سارا بھائی کے سر ہے جن کی کوششوں سے پہلی بار تھمبا (کیرالا) سے ایک تیز رفتار راکٹ خلا میں چھوڑا گیا۔ آج ہم خلائی دوڑ میں کافی پیش رفت کر چکے ہیں۔ 1975 میں پہلا مصنوعی سیارہ آریہ بھٹ خلا میں پہنچایا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک 16 مصنوعی سیارے خلا میں چھوڑے جا چکے ہیں۔ اس سلسلے کے انسیٹ نام کے مصنوعی سیارے بہت کارآمد ثابت ہوئے جن کی مدد سے موسمیات کے بارے میں معلومات اور ٹی.وی. پروگراموں کا ریلے دور دراز کے علاقوں تک ممکن ہوا۔ انسیٹ II، ڈی نام کے مصنوعی سیارے کو 4 جون 1997 کو خلا میں پہنچایا گیا جو ملک بھر میں ٹی.وی. پروگراموں کو ریلے کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو ایشیا کے بیشتر حصوں تک پہنچا رہا ہے۔ انسیٹ E-II خلا میں پہنچنے کے بعد موسمیات کی اور زیادہ معلومات فراہم کرا رہا ہے۔ ان مصنوعی سیاروں کو Launching Vehicles کے ذریعے خلا میں بھیجا جاتا رہا ہے جن میں SLV-A, SLV-III اور PSLV کے نام اہم ہیں۔

جدید سائنس نے ہمیں ریموٹ سنسنگ جیسی ٹیکنالوجی عطا کی ہے جس سے زمین کے اوپر یا زمین کے اندر قدرت کے مخفی خزانوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ پانی کے ذخائر کا علم ہو جاتا ہے اور معدنیات کس کس جگہ پائی جاتی ہیں اس کا علم بغیر زمین کھودے ہو جاتا ہے۔

ابھی حال ہی میں جدید جنیٹک انجینئرس نے کلوننگ کی تکنیک ایجاد کی ہے جس سے ہم شکل جاندار پیدا کیا جا سکتا ہے۔ DNA اور RNA اور ان کے Permutation اور Combination of Genes کے ذریعے من چاہی نئی زندگی پیدا کی جا سکتی ہے جس کی شکل وصورت، عادات واطوار اور آواز بالکل اسی طرح کی ہوگی جس کا کلون بنایا گیا ہے۔

الیکٹرانک کی صنعت بھی انسان کے لیے سائنس کا بہترین تحفہ ہے۔ فرج، واشنگ مشین، بجلی کے پنکھے، کولر اور ایرکنڈیشنر، ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر، ریڈیو، ٹی.وی.، ٹیپ ریکارڈر اور وی.سی.آر. وغیرہ سب ہندوستان میں بننے لگے ہیں۔ ملک میں اعداد وشمار کی مشینیں اور کمپیوٹر بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ آج دنیا کی چوتھی سب سے بڑی صنعت الیکٹرانک مصنوعات کو تیار کرنے میں ہمارا ملک کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ فیکس، ٹیلکس، سیلولرفون یا موبائل ملک میں ہی تیار کیے جا رہے ہیں۔

ہندوستان نے دفاعی سائنس میں بھی کافی ترقی کی ہے۔ ''پرتھوی''، ''آکاش''، ''ترشول''، ''ناگ''، ''اگنی'' جیسے میزائیلوں کو کامیابی کے ساتھ داغا جا چکا ہے۔ ''ارجن'' نام کا جدید قسم کے آلات اور ہتھیاروں سے لیس ٹینک تیار کر کے ہمارے فوجی ساز وسامان میں حال ہی میں شامل کیا گیا ہے۔

یہ تو رہی بات سائنس کی ترقی کی جس نے ہر شعبۂ حیات کو متاثر کیا ہے۔ اب ہم انفارمیشن ٹیکنالوجی اور اس میں کام آنے والے اہم سائنسی آلات، کمپیوٹر اور مائیکرو چپس کی بات کریں گے۔

کمپیوٹر کی تعلیم کو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کمپیوٹر میں ہم کوئی انفارمیشن ڈالتے ہیں تو وہ مشین کے اندر فوراً Process ہوتی ہے اور نتیجہ باہر آ جاتا ہے۔ اب ہمیں یہ جاننا ہے کہ آخر یہ کمپیوٹر کیا چیز ہے اور اس میں مائیکرو چپس کی کیا اہمیت ہے؟

دراصل کمپیوٹر ایک مشین ہے جو انفارمیشن کو Process کرتی ہے یا جمع کر لیتی ہے۔ اس میں تین اہم حصے ہوتے ہیں۔ ایک Input جس میں اطلاعات ڈالی جاتی ہیں۔ وہ Central Processing Unit (CPU) کو پاس کر دیتا ہے۔ یہ دوسرا حصہ ہے، یہ CPU دراصل کمپیوٹر کا دماغ ہوتا ہے جہاں ساری اطلاعات جمع رہتی ہیں اور ان کی Processing ہوتی ہے۔ تیسرا حصہ Output ہے جہاں ہمیں نتیجہ ملتا ہے۔ کمپیوٹر ایک بہت تیز کام کرنے والی مشین ہے جس میں ساری انفارمیشن بالکل صحیح طریقے سے Process ہوتی ہے اور تھوڑی سی جگہ میں بہت ساری انفارمیشن آ جاتی ہے۔ یہ مشین چوبیسوں گھنٹے کام کر سکتی ہے۔

انسانی دماغ میں بھی انفارمیشن جمع ہوتی ہے اور اس کا تجزیہ ہوتا ہے۔ انسانی دماغ سے بڑا کوئی کمپیوٹر نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل جدول انسانی دماغ کی Capacity ظاہر کرتی ہے:

اطلاعات کی قسموں کا اسٹور اور ان کی وسعتیں

اسٹور کی قسمیں	وسعت (ملین کیریکٹر)
انسانی دماغ	125000000
یو.ایس نیشنل آرکائیو	112500000
انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا	12500
میکینیکل ہارڈ ڈسک	313
فلاپی ڈسک	2.5
کتاب	1.3

کمپیوٹر سلی کون کا بنا ہوتا ہے۔ اسی سلی کون چپ میں ساری انفارمیشن بھری جاتی ہیں اور انھی مائیکرو چپس کی وجہ سے کمپیوٹر بہت خوش اسلوبی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ مائیکرو چپس کمپیوٹر کے CPU میں لگایا جاتا ہے تاکہ کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ انفارمیشن اسٹور ہوسکے۔ اطلاعات کی Processing بھی یہیں ہوتی ہے اور Output میں اس کا نتیجہ بہت جلد آجاتا ہے۔ چپ ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہم کمپیوٹر سے جو امید کرتے ہیں وہ سب ہمیں مل جاتا ہے۔

چپ ایک طرح کا Micro Processor ہوتا ہے جس میں بجلی کے سرکٹ ہوتے ہیں۔ یہ CPU سے جڑا ہوتا ہے۔ دراصل یہ کمپیوٹر کا دماغ ہوتا ہے۔ چپ کی مدد سے کمپیوٹر روزمرہ کی ساری چیزوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ Micro Processors کوکر، کار، ویڈیو ریکارڈ، الیکٹرانک کیمرے، الیکٹرک ڈرل، پاکٹ کیلکولیٹر، پٹرول پمپ اور واشنگ مشین وغیرہ میں استعمال ہوتے ہیں۔

Micro Processors صنعتوں میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ Robots کو کنٹرول کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کاروں کے بنانے میں روبوٹ بہت تیزی سے کام کرتے ہیں۔ برٹش لے لینڈ گاڑیوں کے سائیڈ پینل روبو کی مدد سے لگائے جاتے ہیں جو 25 سیکنڈ میں 250 دھکتے ہوئے پینل (Panels) لگا دیتا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب مائیکرو پروسیسرس کی مدد سے ہماری فیکٹریوں میں روبوٹ کے ذریعے کام کیا جائے گا۔

مائیکرو چپس اور کمپیوٹر کا استعمال ہماری بہت سی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ جن میں خاص طور سے ملٹری انجینئرنگ، ادویات، تجارت وصنعت کے میدان ہیں۔ کھانے کے سامان کو تیار کرنے اور لمبے عرصے تک محفوظ رکھنے میں بھی مائیکرو چپس کا بہت اہم کردار ہے۔ کمپیوٹر ہماری بہت سی کارگزاریوں میں بھی مدد کرتا ہے۔ جن میں نقل وحمل، مواصلات، دفاع اور سائنسی ریسرچ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مائیکرو کمپیوٹرس ذاتی حساب رکھنے، ریکارڈ رکھنے، انرجی کنزرویشن اور محافظت کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

سلی کون کا استعمال کمپیوٹر کے علاوہ دفاعی اور شہری کاموں میں بھی ہوتا ہے۔ سلی کون ویفر سورج کی کرنوں کو بجلی میں تبدیل کرنے کے لیے اور Semiconductor Devices بنانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ انھیں Intigrated Chips کہتے ہیں جو خلائی اور میزائیل پروگرام میں استعمال ہوتے ہیں۔

ترقی کے مختلف میدانوں میں نینوٹیکنالوجی کا اہم رول ہے۔ کمپیوٹر کے میدان میں اس کے ذریعے انقلاب آنے کے امکان پیدا ہوگئے ہیں۔ سپر کمپیوٹر اسی نینوٹیکنالوجی کا نتیجہ ہے۔ اس میں Connector کی شکل میں نینو وائر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس وائر کے لگتے ہی کمپیوٹر کی Memory کی رفتار تقریباً دس لاکھ گنا تک بڑھ جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ اس تکنیک کا استعمال اب کمپیوٹر چپ (Chip) کے سرکٹ تیار کرنے میں بھی کیا جانے لگا ہے جو عام چپ کے مقابلے اچھے نتائج فراہم کرتی ہے۔

درس وتدریس کے میدان میں کمپیوٹر مختلف Modes میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ جیسے Tutorial Drill پریکٹس، کھیل، تجربہ گاہوں کے تجربات مسائل کو حل کرنے اور Creative Artistic Projects وغیرہ۔

Creative Mode میں کمپیوٹر ایک ایسا ٹول بن جاتا ہے جس سے کوئی بھی اپنے کو Artistic طور پر ظاہر کرسکتا ہے۔ وہ ایک ایسا ٹول مہیا کردیتا ہے جس سے گانا، الیکٹرانک برش تصویر بنانے کے لیے یا اسکیچ پیڈ ڈرائنگ کے لیے بنایا جاسکتا ہے۔ یہ سارے معجزے مائیکرو چپس کی مدد سے کیے جاسکتے ہیں۔

کھلی اطلاعات کا کلچر پیدا کرکے سماج کو عالمی سطح پر مربوط کرنے کے لیے انفارمیشن ٹیکنالوجی کی مزید توسیع وترقی کی کوششیں کی جارہی ہیں معیشت کے مختلف شعبوں مثلاً بینکنگ، انشورنس، مالی خدمات، اسٹاک ایکس چنج، انکم ٹیکس، ریلوے، ایرلائن، تیل، بجلی، دفاع، پولیس، صنعت، سرکاری دفاتر، تعلیمی وتحقیقی اداروں وغیرہ میں بڑے پیانے پر کمپیوٹر استعمال کیے جارہے ہیں جن میں مائیکرو چپس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

□□□

پتہ:
46, Nishat Apartment, Near Shamshad Market,
Aligarh Muslim University,
Aligarh (U.P.) 202002

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولیں ہے۔

عظیم اقبال

سیّارچے — خطرات اور امکانات

سیارچے، وہ بے شمار اجسام فلکی ہیں جن کا قطر ایک میل سے لے کر صد ہا میل تک ہوسکتا ہے۔ یہ اجسام سیارچوں کی مخصوص پٹی (BELT) میں جو خصوصیت سے مریخ (MARS) اور مشتری (JUPITER) کے درمیانی خطے میں واقع ہے، گردش کرتے ہیں۔ انھیں پلانیٹوائڈ (Planetoid) بھی کہتے ہیں۔

سیارچوں سے پیدا شدہ خطرات کا جائزہ لینے سے قبل ان سے وابستہ چند واقعات پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔

یہ واقعہ اکتوبر 1937 کا ہے۔ یہ وقت شب وہ خاموشی سے گزر گیا۔ اس نے اپنے عقب میں ایک مدھم سفید لکیر چھوڑی۔ جو ٹیلیسکوپ کی تصویری پلیٹ پر مرتسم ہوگئی۔ کارل رئمتھ (Karl Reinmuth)، جو جرمنی میں ہیڈل برگ (Heidel Berg) رصدگاہ (Observatory) سے وابستہ تھا، دیگر ماہرین فلکیات نے اس فلکی پیکر کے مدار کی پیائش کی اور بعد ازاں اُسے ''ہرمیس'' (Hermes) نام دیا— یہ تقریباً 45400 کیلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے رواں تھا۔ یہ زمین پر ضرب لگاتے، لگاتے رہ گیا۔ زمین اور چاند کے درمیانی فاصلے کے دونے سے ذرا ہی کم فاصلے سے یہ گزرا۔ یوں، فلکی اصطلاح میں زمین بال بال بچی۔

''ہرمیس'' سیارچوں میں سے ایک ہے۔ ان سیارچوں کی مختصر قامت اور ان کی غیر متناسب اشکال سے انھیں اڑتے ہوئے پہاڑوں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بڑے سیاروں (Planets) کے برخلاف، سیارچے ناہموار مداروں پر رواں ہوتے ہیں، جو آفتاب کے گرد زمین کے اپنے سالانہ راستے میں ملتے ہیں، اور وہ ہمارے سیارے، زمین سے متصادم ہوسکتے ہیں لہٰذا ان کے خطرات صرف قیاس پر نہیں، بلکہ حقیقت پر مبنی ہیں۔

اگر سیارچے ''ہرمیس'' کی زمین سے ٹکر ہوجاتی تو اس تصادم سے ایک میگاٹن کے ایک لاکھ بموں کے مساوی توانائی کا اخراج ہوتا— ''ہرمیس'' کا قطر محض ایک کیلومیٹر کے قریب ہے۔ اگر اس سے دس گنی جسامت کا کوئی سیارچہ زمین سے متصادم ہوجاتا تو زمین یوں مرتعش ہوتی گویا کسی گھنٹے پر شدت سے ضرب لگائی گئی ہو۔ اس کے سبب زلزلے آتے، بحری لہریں اٹھتیں، سالہا سال تک غبار اور دھوئیں اور آبی بھاپ سے کرۂ ارض آلودہ رہتا۔ اس کا انحصار اس پر ہوتا کہ سیارچے نے بحری یا بری کس خطے پر ضرب لگائی ہے۔ اس سے زمین کا موسم بدل جاتا، اور یہ کروڑوں مخلوقات کے لیے ہلاکت خیز ثابت ہوتا۔ ظاہر ہے کہ امکانی خطرات کے تذکرے مہیب ہیں لیکن ان سے غافل نہیں رہا جاسکتا۔

دیکھا جائے تو زمین کے ساتھ سیارچوں کی آنکھ مچولی عہد پارینہ سے چلی آرہی ہے۔ زمین اپنی تاریخ میں کئی بار سیارچوں کی ضرب کے باوجود اپنے وجود کو قائم رکھ سکی ہے۔ مثال کے لیے تقریباً 3 کروڑ سال قبل ایک سیارچے نے آج کے شکاگو کے 110 کیلومیٹر جنوب میں 13 کیلومیٹر عریض آتش فشاں دہانے (Crater) کو جنم دیا۔

زمین پر سیارچوں کی کارستانی کی یہ واحد نشانی نہیں ہے۔ ایک دیگر آتش فشانی دہانہ، جس کی چوڑائی 35 کیلومیٹر ہے، یہ آیوا، (IOWA) میں مینسن (Manson) کے قریب واقع ہے۔ مجموعی طور پر سیارچوں کے پیدا کردہ 100 آتش فشاں دہانوں کی نشاندہی ہوچکی ہے۔

سیارچوں کی پٹی مریخ اور مشتری کے درمیان واقع ہے۔ اس پٹی میں موجود سیارچوں کی تعداد دس ہزار ملین سے زائد ہے۔ وہ دھول کے ذرّے کے برابر بھی ہیں اور سب سے بڑے سیارچے ''سیریس'' (Ceres) کا وجود بھی ہے، جس کے قطر کا اندازہ 1,025 کیلومیٹر ہے۔

سیارچوں کی نقل وحرکت کا مشاہدہ کافی عرصے پہلے سے کیا جاتا رہا ہے۔

امریکی ماہر فلکیات ڈینیل کرک ووڈ (Daniel Kirkwood) نے ایک صدی قبل بتایا تھا کہ سیارچوں کی پٹی دو خطوں میں منقسم ہے۔ دونوں خطوں کے درمیان ایک پُراسرار خلا ہے۔ جسے اب کرک ووڈ خلا (Kirkwood Gap) سے موسوم کیا جاتا ہے۔

1982 میں ماہر طبیعیات جیک وزڈم (Jack Wisdom) نے جو بعد ازاں ایم آئی ٹی (MIT Massachusets Institute of Technology) سے وابستہ رہے، دریافت کیا کہ مشتری اور دیگر مقامات پر کشش ثقل کی قوتوں کے سبب ایک کائناتی پن بال مشین (Cosmic Pinball Machine) کی تشکیل ہوتی ہے۔ جو کوئی سیارچہ کرک ووڈ گیپ میں ضرب سے پہنچتا ہے، آخرکار زمینی مدار کے قریب آجاتا ہے۔ ہر پانچ خارج شدہ سیارچوں میں سے ایک زمینی مدار کو پار کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیارچوں کی ابتدا کیسے ہوئی؟ کیا وہ کسی تباہ شدہ سیارے کا ملبہ ہیں؟ اس نظریے پر غور ہوا ہے، لیکن آج یہ قابل قبول نہیں ہے۔ کئی سائنسداں کسی دیگر امکانی تشریح پر یقین کرتے ہیں۔

تقریباً 4600 ملین (4 ارب 60 کروڑ) سال قبل، غبار اور گیسوں کے بھنور سے سیاروں کی تشکیل ہو رہی تھی۔ چونکہ وہ آفتاب کے گرد گھوم رہے تھے، ان کی کشش ثقل باقی ماندہ ملاحدہ حصوں کو بہالے گئی۔ نظام شمسی ہر جگہ، ماسوا سیارچوں کی پٹی کے، شفاف ہوگیا۔ وہاں مشتری کی کشش ثقل اتنی شدید تھی کہ وہ آفتاب کی مخالف کشش کو متوازن کرسکتا تھا۔ یوں، علاحدہ حصے اپنے سیاروں میں یکجائی سے محروم رہ گئے۔ اس نظریے کے مطابق سیارچے روز آفرینش کے باقی ماندہ (Left Over) حصے ہیں۔

متعدد سائنس داں ایک ایسے نظریے کو تسلیم کرتے ہیں، جو کبھی سائنسی داستانوں جیسا تھا۔ تقریباً 65 ملین (6 کروڑ 50 لاکھ) سال قبل ایک سیارچہ جس کا قطر 10 سے 16 کیلومیٹر تھا، زمین سے آ ٹکرایا۔ اس نے ہمیشہ کے لیے دنیا کا نقشہ بدل ڈالا۔ اس کے زبردست اثر زلزلے آئے۔ بحری لہریں اٹھیں۔ بڑے بڑے آتش فشاں پھٹ پڑے۔ جنگلوں میں آگ لگ گئی۔ کرۂ ارض میں منوں غبار اور چٹان کے برادے یا سفوف کا پھیلاؤ ہوگیا۔ وہاں ان کا وجود سالہا سال تک رہا۔ اس سے آفتابی شعاعیں پوشیدہ ہوگئیں۔ اس سے فوٹو سنتھے سس (Photo Synthesis) کا عمل تھم گیا۔ سمجھا جاتا ہے کہ ہزاروں مخلوق، بہ شمول ڈائناسور (Diano Saours) فاقے سے ہلاک ہوگئے۔

65 ملین سال پہلے کے اس سیارچے کا تصور کیجیے، جس کے تصادم، نیز دیگر سیارچوں کے تصادم کے باوجود موجودہ دنیا کا وجود برقرار ہے اور مخلوق انسانی ہنوز ناپید نہیں ہے۔

اب آیئے ایک اور واقعے پر نگاہ ڈالیں۔ یہ واقعہ 30 جون 1908 کا ہے۔ سائبریا کے جنگلات سے ذرا دور اوپر، کوئی چمکتی سی شے آسمان میں تیزی سے لپک گئی اور پھر پھٹ پڑی۔ اس کی توانائی 12 میگاٹن ہائیڈروجن بم کے مساوی تھی۔ ٹنگسکا (Tun Guska)، روس کے اس واقعے کی بازگشت دور افتادہ انگلینڈ تک چلی گئی۔ اس کی چوٹ سے پیدا شدہ لہروں (Shock Waves) سے 80 کیلومیٹر کے خطے میں سارے درخت زمیں بوس ہوگئے۔ ملبے اور غبار سے فضا اٹ گئی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''ٹنگسکا'' کا یہ زبردست دھماکہ کسی مرجھائے دم دار ستارے (Fading Comet) کی وجہ سے ہوا یا کسی چٹانی سیارچے کے سبب ہوا؟

سائنسداں تا حال اس موضوع پر مباحثے میں شریک ہیں۔ یوجین شوماکر (Eugene Shoe Maker) جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے جیولوجیکل سروے (Geological Survey) سے وابستہ رہے، کہتے ہیں کہ 12 سے 40 فی صد امکان یہ ہے کہ دوسرا ایسا واقعہ اگلے 75 برسوں میں پھر ہوگا۔

1980 میں امریکی سائنسدانوں کی ایک ٹیم نے ڈائناسور کے ناپید ہونے کے نظریے پر گفتگو کی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی ایسے امکانی تصادم کے سبب پوری نسل انسانی نیست و نابود ہوسکتی ہے۔ سائنسدانوں نے اس بات پر بھی غور کیا کہ مہیب اور ہیبت ناک سیارچوں کا پتہ لگایا جائے اور اگر وہ بہت قریب آجائیں تو ان سے محفوظ رہنے کے طریقے تلاش کیے جائیں۔

اب سوال یہ ہے کہ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے کسی ایسے سیارچے سے جس کے زمین سے تصادم کے امکانات ہوں، ہم کیسے نمٹ سکتے ہیں؟ یہی سوال 1967 میں MIT کے پروفیسر Paul Sandorff نے اپنے طلبہ کے سامنے رکھا۔ ICARUS سیارچہ جس کا قطر ڈیڑھ کیلومیٹر ہے، اگر اگلے چھ ماہ میں زمین سے متصادم ہونے والا ہو تو وہ زمین کو کیسے محفوظ رکھ سکیں گے؟

طلبہ کی تجویز تھی کہ نیوکلیائی میزائل سے اس سیارچے کے کنارے پر دھماکہ کرکے اسے اپنے راستے سے منحرف کردیں گے۔ سینڈروف نے طلبہ کی تجویز کو 90 فی صد کامیابی سے ہم کنار ہونے والا منصوبہ قرار دیا۔

ایک واقعہ لیں۔ 9 اپریل 1984 کو جاپانی ایئر لائنز کی پرواز کے عملے نے سانپ کی چھتری (Mushroom) سے مشابہ بادلوں کو 21000 میٹر اونچے اور 320 کیلومیٹر عریض شکل میں دیکھا۔ انھیں اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ کسی تابکار نیوکلیائی بادل سے ہوکر نہ گزر رہے ہوں، اس اندیشے پر پائلٹ نے امریکی ہوائی فوج کے اڈے اینکورج (Anchorage) کی جانب اپنی پرواز موڑ دی۔ تاہم، بعد ازاں کی گئی جانچوں سے کسی تابکاری کا پتہ نہ چلا۔ دو ماہرین نے خیال ظاہر کیا کہ ہوائی جہاز کسی شہاب ثاقب (Meteor) کے پھٹنے سے وجود میں آئے روشن بادل کے قریب سے گزرا ہوگا۔

کسی سیارچے کے زمین سے متصادم ہونے کا اندیشہ حقیقی ہے، تاہم کم ہے۔ شوماکر کے بقول Hermes کی قوت کے سیارچے کے زمین سے متصادم ہونے کا امکان ایک لاکھ سال میں ایک بار ہی ہے۔ ایک سیارچہ جس کا قطر 25 میٹر ہو، ایک میگاٹن کی توانائی خارج کرتا ہے، وہ کرۂ ارض میں ہر 30 سال بعد داخل ہوجاتا ہے۔

سائنسدانوں کے برخلاف قمار بازوں کی نگاہ میں خطرہ اس قدر نہیں ہے کہ اس کے بارے میں متفکر ہوا جائے۔ یہ واقعہ ہے کہ وہی قمار باز، ان سیارچوں میں، جو محو پرواز طلائی معدن ہیں، دلچسپی دکھا سکتے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ کسی 1600 میٹر عریض سیارچے میں عمدہ قسم کا نکل (Nickel) اور فولاد

موجودہ قیمتوں پر 10 سے 15 Trillion ڈالر مالیت کا ہوسکتا ہے۔

اندازہ یہ بھی ہے کہ فولاد اور نکل کے علاوہ چند سیارچوں سے سونے اور پلاٹینم کے مخزن بھی دستیاب ہوسکتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ معدنیات سے پُر کچھ سیارچوں کے مدار زمین سے اتنے قریب ہیں کہ ان تک رسائی اسی طرح ممکن ہوسکتی ہے جس طرح چاند تک ہوئی۔ انھیں خلائی پڑاؤ (Space Station) میں بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

اس سمت میں پیش رفت ہورہی ہے۔ Arizona centre for space qesources کے محققین نے ایسے طریقے نکالے ہیں، جن میں روبوز (Robots) کا استعمال ہوتا ہے اور جن کے ذریعے خلائی سیارچوں سے مختلف نوع کے دھات نکالے جاسکتے ہیں۔

ماہرین سیارچوں کا جائزہ لے رہے ہیں اور سیارچوں تک رسائی کے لیے کوشاں ہیں۔ 160 ملین کیلومیٹر دور اقتادہ سیارچے Vesta پر مشن بھیجنے کے لیے بھی کوششیں جاری ہیں۔

ڈائناسور، جن کی کبھی زمین پر حکمرانی تھی کسی سیارچے کی زد میں آکر اپنا وجود کھو بیٹھے۔ ہمارے روبرو چیلنج یہ ہے کہ ان سیارچوں کو مسخر کرکے ستاروں کے درمیان نوع انسانی کو ایک تابناک زندگی بخش سکیں۔

ستاروں کے درمیان ہی کیا، اگر ہم کوشاں ہوں تو ستاروں کے آگے بھی جہاں بنا سکتے ہیں!

❑❑❑

پتہ:
Adabistan, Ganj No.I,
Bettiah, 845438, Bihar

جدید
ہندی — اردو لغت (دو جلدوں میں)

(ہندی الفاظ کے معنی اردو اور دیوناگری رسم الخط میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

(سابق چیئر پرسن، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

تکنیک اور ترتیب و تقسیم کے اعتبار سے "جدید۔ ہندی اردو لغت" اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم و جدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، تاخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی و مفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ تحقیق ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3383 (دونوں جلدیں)، قیمت -/1700 روپے (دونوں جلدیں)

اقبال کی کہانی (پانچواں ایڈیشن)

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال کو عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعرانہ کمالات کے علاوہ ان میں شگفتہ مزاجی بھی غضب کی تھی۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں میں بڑے باریک نکتے اور بذلہ سنجی پائی جاتی ہے۔ اقبال کو اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی خوب صورت نظمیں لکھیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کا جامع تعارف اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت -/13 روپے

عبدالعلیم قدوائی

اقلیتی طلبہ کی کوچنگ اسکیم

کسی بھی سیکولر جمہوری ملک کے لیے ضروری ہے کہ وہاں کی اقلیتیں مطمئن ہوں اور ملک کی عام ترقی وخوشحالی کے دھارے میں پوری طرح شامل ہوں۔ اگر کسی اقلیت کو مذہب، زبان یا کلچر کی بنا پر عام شہری سہولتوں اور ترقی کے مواقع نہ ملنے یا کم ملنے کی شکایت پیدا ہوتی ہے تو اس سے ملک کے جمہوری اور سیکولر کردار پر حرف آتا ہے اور انتظامیہ کی غیر جانب دارانہ اور صاف ستھری کارکردگی کے متعلق شبہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت ہمارا ملک بھی کچھ اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہے۔ سرکاری اور نجی زمروں میں روزگار کے مواقع کے متعلق کچھ اقلیتوں کو نظرانداز کیے جانے یا انصاف نہ ملنے کی شکایت پیدا ہورہی ہے۔ اس کے ازالے کے لیے حکومت نے متعدد اقدام کیے ہیں اور کچھ مفید اسکیموں کا اعلان کیا ہے۔ ایسی ہی ایک مفید اسکیم اقلیتی معاملات کی وزارت کی طرف سے اقلیتی فرقوں سے تعلق رکھنے والے طالب علموں کی مفت کوچنگ کے لیے ملک کے طول وعرض میں جولائی 2007 سے شروع کی گئی ہے۔ اس اسکیم کا خاص مقصد یہ ہے کہ سماج کے کمزور طبقوں کے طلبہ کو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے ذریعے ایسی ٹریننگ اور رہنمائی فراہم کرائی جائے جس سے انھیں ملک کے اندر مختلف سطح کی سرکاری وغیر سرکاری ملازمتوں، صنعتوں اور کاروبار میں نیز ممالک غیر میں معقول روزگار مل سکے اور وہ اپنی صلاحیتوں اور مہارت سے ملک وملت کی خدمت کرسکیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس اہم مسئلے کی طرف حکومت ہند نے چھٹے پنج سالہ منصوبے ہی سے توجہ کی اور پسماندہ ذاتوں، قبیلوں اقلیتوں اور پچھڑے ہوئے طبقوں کی کوچنگ کے لیے الگ الگ اسکیمیں تیار کی گئیں۔ متعدد ریاستی حکومتوں نے بھی اس سلسلے میں پیش رفت کی۔ ستمبر 2001 میں ان تمام اسکیموں کو یکجا کردیا گیا اور کوچنگ کی سہولتیں ایک مشترکہ اسکیم کے تحت فراہم کی جانے لگیں۔

مرکزی سطح پر اقلیتی امور سے متعلق ایک وزارت کی تشکیل کے بعد اقلیتی فرقوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے لیے مفت کوچنگ اسکیم اس سال سے شروع کی جارہی ہے۔ اس اسکیم کی افادیت کے پیش نظر اس کے خاص نکات اور ان کی توضیح وتشریح اس مضمون میں پیش کی جارہی ہے تاکہ اردو داں طبقہ اس سے بخوبی واقف ہوجائے۔

اغراض ومقاصد:

یہ خصوصی کوچنگ اسکیم اقلیتی طبقوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے لیے شروع کی جارہی ہے اور یہ مفت دی جائے گی۔ اس کے اغراض ومقاصد حسب ذیل ہیں:

(الف) طلبہ کو مختلف ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ کورسوں جیسے انجینئرنگ، میڈیکل تعلیم، قانون، انفارمیشن ٹیکنالوجی، بزنس مینجمنٹ، ادب وانشا وغیرہ کے داخلے کے امتحانوں کے لیے تیار کرنا جو ملک کی یونیورسٹیوں اور غیر ملکی یونیورسٹیوں کی طرف سے ہوتے رہتے ہیں اور جن میں داخلے سے طلبہ کو بہتر ذریعۂ معاش حاصل ہوسکتے ہیں۔

(ب) مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے گروپ اے، بی، سی اور ڈی افسروں کی بھرتی کے لیے ہونے والے مقابلہ جاتی امتحانوں کے لیے تیاری کرانا۔ ان انتظامی عہدوں کے علاوہ پولیس، سیکوریٹی فورس ریلوے، پبلک اداروں، بینکوں، انشورنس کمپنیوں اور دیگر خودمختار اداروں کے افسروں اور عہدہ داروں کے انتخاب اور مقابلے کے امتحانوں کی تیاری کرانا۔

(ج) پرائیویٹ سیکٹر میں ایرلائنز، شپنگ، انفارمیشن ٹیکنالوجی، بزنس، فنانشیل مینجمنٹ ہوٹل، سیاحت، بحری سرگرمیوں، مارکیٹنگ، خرید وفروخت، بایوٹیکنالوجی اور دیگر خاص قسم کے امتحانات اور ٹریننگ کے لیے طلبہ کو تیار کرنا۔

(د) انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سطح پر طلبہ کی علمی لیاقت واستعداد کو بڑھادینا اور ضرورت کے مطابق کورس کی تیاری کرانا۔

کوچنگ دینے والے اداروں کی اہلیت کے شرائط:

اسکیم کے تحت مندرجۂ ذیل ادارے کوچنگ پروگرام چلانے کے اہل قرار دیے گئے ہیں...

(i) سرکاری سطح پر تسلیم شدہ تمام یونیورسٹیاں اور خودمختار ادارے جو کوچنگ دینے میں مصروف ہیں

(ii) گورنمنٹ سیکٹر کے تمام ادارے اور یونیورسٹیاں جو اقلیتی طلبہ کی ضرورت کے متعلق مختلف کارآمد کوچنگ پروگرام چلارہی ہیں

(iii) پرائیویٹ سیکٹر کی وہ یونیورسٹیاں (بشمول ان اداروں سے جنھیں یونیورسٹی کے مساوی درجہ دے دیا گیا ہے) اور کالج جو کوچنگ دے رہے ہیں

(iv) پرائیویٹ سیکٹر کے وہ ٹرسٹ، کمپنیاں، پارٹنرشپ فرمیں یا رجسٹرڈ سوسائٹیاں یا کسی صنعت سے منسلک تسلیم شدہ ادارے جن کو اس مقصد کے لیے بنایا گیا ہے اور تسلیم کیا گیا ہو

کوچنگ دینے والے اداروں کے لیے حسب ذیل شرائط کی پابندی لازمی ہے...

(i) ان اداروں کے پاس ہمہ وقتی یا جزوقتی لائق اور تجربہ کار استاد ہونا چاہیے۔

(ii) ان اداروں کے پاس ٹریننگ اور کوچنگ کے لیے ضروری جگہ لائبریری اور سازوسامان ہونا چاہیے۔ یہ شرط پولیس کانسٹبلوں یا ریلوے سیکوریٹی کی بھرتی کے لیے لازمی ہیں

(iii) ان اداروں کے پاس کوچنگ کا کم سے کم تین سال کا تجربہ ہونا چاہیے۔ جن اداروں کے پاس تین سال سے کم کا تجربہ ہے لیکن ان کے یہاں کامیابی کی شرح بہت اچھی ہے تو ان کو بھی موقع دیا جاسکتا ہے

(iv) کوچنگ دینے والے اداروں کو کم سے کم 15% کامیابی کی شرح دکھانا ہوگی۔ اس مقصد کے لیے تین سال کی کامیابی کا اوسط پیش نظر رکھا جائے گا۔ نمایاں کامیابی دکھانے والے اداروں کو ترجیح دی جائے گی

(v) جو کوچنگ دینے والے ادارے طلبہ کو مختلف کورسوں میں داخلے کے امتحانات کے لیے تیار کرتے ہیں اور ان کے طلبہ کو اچھے کالجوں اور اداروں میں داخلہ مل جاتا ہے ان کو ترجیح دی جائے گی

(vi) پرائیویٹ سیکٹر کی ملازمتوں کے لیے مخصوص صنعتی کورسوں اور ملازمتوں کے لیے کوچنگ کی ہمت افزائی کی جائے گی

اسکیم کے طریق کار کی تفصیل:

وزارت اقلیتی امور حکومت ہند ہر سال کی 30 اپریل تک اس اسکیم کی تفصیلات شائع کرے گی اور ملک کے کوچنگ اور ٹریننگ اداروں سے درخواستیں طلب کرے گی۔

گورنمنٹ سیکٹر کے ادارے متعلقہ وزارت (اقلیتی امور) سے مقررہ درخواست کا فارم منگوا کر براہ راست وزارت کو بھیج سکتے ہیں لیکن پرائیویٹ ادارے، غیر سرکاری یا رضاکار تنظیمیں اپنی درخواستیں اپنی ریاستی حکومت یا مرکزی علاقے کے انتظامیہ کے ذریعے سے بھیجیں۔ ریاستی حکومتیں/مرکزی علاقوں کی حکومتیں ان اداروں کی اہلیت اور کارکردگی کا معائنہ کرنے کے بعد ان کی تجاویز کو اپنی سفارشات کے ساتھ اقلیتی امور کی وزارت کو بھیجیں گی۔

درخواستوں کے موصول ہونے کے بعد وزارت برائے اقلیتی امور ان کی تفصیلی جانچ کرے گی اور پھر ایک کمیٹی کے سامنے پیش کرے گی جس میں حسب ذیل ممبران ہوں گے۔

(1) سکریٹری وزارت برائے اقلیتی امور	صدر
(2) فائنشل ایڈوائزر وزارت برائے اقلیتی امور	ممبر
(3) جوائنٹ سکریٹری وزارت برائے اقلیتی امور	ممبر
(4) وزارت وسائل انسانی کا ایک نمائندہ	ممبر
(5) وزارت محنت کا ایک نمائندہ	ممبر
(6) یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا ایک نمائندہ	ممبر
(7) ڈائرکٹر/ڈپٹی سکریٹری وزارت برائے اقلیتی امور	کنوینر

یہ کمیٹی جب کبھی ضرورت سمجھے کسی پیشہ ور (ایک یا ایک سے زیادہ کو ایک مالیاتی سال کے لیے اپنا ممبر بنا سکتی ہے۔

کوچنگ میں شرکت کی شرائط:

1. کوچنگ میں وہی طلبہ یا امیدوار شامل ہوسکتے ہیں جنھوں نے مطلوبہ کورس یا بھرتی کے امتحانات میں داخلے کے لیے مقررہ امتحان میں ضروری نمبر حاصل کیے ہوں

2. اس اسکیم کا فائدہ صرف ان امیدواروں/طلبہ کو ملے گا جن کا تعلق کسی اقلیت سے ہو اور جن کے کنبے کی تمام ذرائع سے ہونے والی سالانہ آمدنی ڈھائی لاکھ روپے سے زیادہ نہ ہو

3. کوچنگ سے طلبہ یا امیدوار صرف ایک مرتبہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس کا تعلق کسی خاص مقابلے کے امتحان میں ملنے والے مواقع سے نہ ہوگا۔ کوچنگ دینے والے ادارے کو ہر طالب علم/امیدوار سے اس مضمون کا حلف نامہ لینا ہوگا کہ اس نے اس اسکیم کے تحت ابھی تک کوئی فائدہ نہیں حاصل کیا ہے

4. اگر کوچنگ کے ذریعے کسی امتحان کے دو مرحلے ہوں تو طلبہ/امیدواروں کو دونوں مرحلوں کے لیے کوچنگ دی جائے گی بشرطیکہ انھوں نے ابتدائی مرحلے میں کامیابی حاصل کرلی ہو

5. کوچنگ میں شریک ہونے والے تمام طلبہ کے لیے سب درجوں میں حاضری لازمی ہے۔ اگر کوئی طالب علم بلا کسی معقول وجہ کے پندرہ دن سے زیادہ کوچنگ سے غیر حاضر رہتا ہے یا کوچنگ کو بیچ میں چھوڑ دیتا ہے تو اس طالب علم پر جو رقم خرچ ہوئی ہوگی وہ پوری متعلقہ کوچنگ ادارے سے وصول کی جائے گی

اسکیم کے فنڈ کا انتظام:

اس اسکیم کے تحت منتخبہ کوچنگ/ٹریننگ اداروں کو سو فی صدی مالی امداد فراہم کی جائے گی۔ وزارت اس اسکیم کے تحت ہر طالب علم/امیدوار کو وظیفہ دے گی۔ مالی اعانت کی تفصیل معہ اس کی شرح کے ذیل کے نقشہ میں بتائی گئی ہے۔

کوچنگ کا نام اور قسم	کوچنگ کی فیس	وظیفہ کی رقم
1. گروپ ''اے'' کی ملازمتوں کے لیے	جو ادارہ مقرر کرے مگر یہ رقم بیس ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں ہوسکتی	باہر سے آنے والے طلبہ کے لیے پندرہ سو روپئے اور مقامی طلبہ کے لیے ساڑھے سات سو روپئے
2. گروپ ''بی'' کی ملازمتوں کے لیے	جو ادارہ مقرر کرے مگر یہ رقم پندرہ ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں ہوسکتی	باہر سے آنے والے طلبہ کے لیے پندرہ سو روپئے اور مقامی طلبہ کے لیے ساڑھے سات سو روپئے
3. گروپ سی کی ملازمتوں کے لیے	جو ادارہ مقرر کرے مگر یہ رقم دس ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں ہوسکتی	باہر سے آنے والے طلبہ کے لیے پندرہ سو روپئے اور مقامی طلبہ کے لیے ساڑھے سات سو روپئے
4. ٹیکنیکل یا پروفیشنل کورسوں میں داخلہ کے لیے	جو ادارہ مقرر کرے مگر یہ رقم بیس ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں ہوسکتی	باہر سے آنے والے طلبہ کے لیے پندرہ سو روپئے اور مقامی طلبہ کے لیے ساڑھے سات سو روپئے
5. پرائیویٹ سیکٹر کی ملازمتوں کے لیے	جو ادارہ مقرر کرے مگر یہ رقم بیس ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں ہوسکتی	باہر سے آنے والے طلبہ کے لیے پندرہ سو روپئے اور مقامی طلبہ کے لیے ساڑھے سات سو روپئے
6. مناسب تعلیمی کوچنگ	اضافی تعلیم دینے والے درجوں کی زائد فیس جو ادارہ مقرر کرے	
7. پولیس (کانسٹبل) سیکوریٹی فورس، ریلوے (5 دنوں سے زیادہ نہیں)	ادارہ کمیٹی کی منظوری سے برائے نام فیس مقرر کرے گا۔	باہر کے امیدواروں کے لیے 100 روپئے اور مقامی امیدواروں کے لیے 50 روپئے۔

یہ امداد وزارت برائے اقلیتی امور کو کوچنگ دینے والے ادارے کے اس بینک اکاؤنٹ میں براہ راست جمع کرائے گی جو خاص اسی مقصد کے لیے کھولا گیا ہو۔ یہ مالی امداد جنرل فنانشیل رولز کے ضوابط اور وزارت کے اہم فیصلوں کے ماتحت دی جائے گی۔ یہ فنڈ اداروں کو دو قسطوں میں دیے جائیں گے۔ پہلی قسط 70% اور دوسری قسط 30% کی ہوگی۔ اس مالی امداد کی تجدید سنٹرل گورنمنٹ/ریاستی حکومت یا وزارت امور اقلیت کی نامزد کردہ ایجنسی کے سالانہ معائنے اور رپورٹ کے بعد ہوگی۔ ایک سال کے بعد مقابلے کے امتحانات اور پرائیویٹ سیکٹر کی ملازمتوں میں ادارے سے کوچنگ حاصل کرنے والے طلبہ کی کامیابی کے پیش نظر اس ادارے کی مالی امداد کی تجدید کی جائے گی اس اسکیم میں اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ اس کے فنڈ سے فائدہ ملک/ریاست کے سبھی جغرافیائی علاقوں کو پہنچے۔ اس مقصد میں کوچنگ حاصل کیے ہوئے طلبہ کے پتوں سے مدد مل سکتی ہے۔

کوچنگ دینے والے اداروں کے لیے شرائط وضوابط:

(1) کوچنگ دینے والے ہر ادارے کا فرض ہوگا کہ وہ اپنے کوچنگ پروگرام میں شامل ہر امیدوار کا نام، پتہ ٹیلی فون نمبر، کنبہ کی آمدنی کی تفصیل اپنے پاس رکھے اور اس کی اطلاع وزارت امور اقلیت کو دے

(2) ہر ادارے کو تمام امیدواروں کی عمر، جنس، تعلیمی لیاقت اور بینک اکاؤنٹ نمبر کی تفصیلات اپنے پاس رکھنا ہوں گی

(3) امیدواروں کو منظور شدہ وظیفہ ہر ماہ ادارے کو ان کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرانا ہوگا

(4) وزارت کی طرف سے اس اسکیم کے لیے دیے ہوئے فنڈ کا علاحدہ حساب ادارہ رکھے گا جس کو وزارت امور اقلیت جب بھی چاہے مانگ سکتی ہے اور اس کا معائنہ کرسکتی ہے

(5) اداروں کو فنڈ انھی مدوں میں خرچ کرنا ہوگا جن کی اجازت ان کو وزارت نے دی ہے۔ ہر ادارے کو تحریری ضمانت دینی ہوگی کہ اگر اس دفعہ کی

خلاف ورزی کی گئی تو ادارہ پوری رقم معہ 18% سود جرمانہ کے وزارت کو واپس لوٹانے کا پابند ہوگا۔ اس کے علاوہ حکومت جو قدم ضروری سمجھے اس ادارے کے خلاف اٹھا سکتی ہے

(6) ہر ادارے کو کوچنگ میں شریک ہونے والے ہر امیدوار سے یہ حلف نامہ لینا ہوگا کہ اس نے اس سے قبل اس اسکیم یا حکومت کی کسی اور اسکیم سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے

(7) ہر منتخب ادارے کو ان شرائط وضوابط کی منظوری کا اقرار نامہ وزارت اقلیتی امور کو دینا ہوگا اور اس کے ساتھ ایک بانڈ جس پر دو ضمانت داروں کے دستخط ہوں گے مجاز ادارے کو دینا ہوگا جس میں اسکیم پر ٹھیک ڈھنگ سے عمل درآمد کرنے اور منظور شدہ گرانٹ کا حساب داخل کرنے کی ذمے داری لی گئی ہو۔

(8) یہ ہر ادارے کی ذمے داری ہوگی کہ وہ کوچنگ میں اچھی لیاقت اور استعداد والے طلبہ/ امیدواروں کو شامل کرے

(9) ہر ادارے کو اپنا بینک اکاؤنٹ مع پورے پتے کے بتانا ہوگا جس میں منظور شدہ کوچنگ فیس کی رقم براہ راست جمع کرائی جائے گی

(10) کوچنگ پروگرام کے ختم ہونے کے بعد ہر ادارے کو یہ سرٹیفکیٹ داخل کرنا ہوگا کہ اس نے مالی امداد کو صحیح طور پر استعمال کیا ہے اور اسی کے ساتھ کسی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کے ذریعے آڈٹ شدہ حسابات بھی وزارت اقلیتی امور کو بھیجنا ہوں گے

(11) ہر ادارے کو اپنی آمد وخرچ کا حساب مع بیلنس شیٹ کے جمع کرنا ہوگا

(12) ہر ادارے کو ایک سرٹیفکیٹ اس مضمون کا دینا ہوگا کہ اس نے اسی مقصد کے لیے مرکزی حکومت، ریاستی حکومت یا کسی مرکزی علاقے کی حکومت یا اس کے کسی محکمے سے کوئی امداد حاصل نہیں کی ہے۔

(13) ہر منتخبہ ادارے کو منظور شدہ پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے بہترین وسائل کا استعمال کرنا چاہیے اور اس کی نگرانی کرنی چاہیے کہ کوچنگ/ ٹریننگ پروگرام یا امیدواروں کو وظیفہ دینے میں کسی طرح کی دیر نہ ہو

جانچ اور نگرانی:

منظور شدہ اداروں میں کوچنگ کی جانچ اور نگرانی اس طرح کی جائے گی

(1) ہر ادارہ مقررہ فارم پر جو وزارت برائے اقلیتی امور اور ریاستی حکومت سے منظور کیا گیا ہو، کو چنگ کی پروگریس رپورٹ وقتاً فوقتاً بھیجتا رہے گا

(2) ہر ادارہ وزارت اقلیتی امور کو اپنے کو ترتیب کردہ امیدواروں/ طلبہ کی ملازمت کے بارے میں اطلاع دیتا رہے گا خواہ وہ سرکاری سیکٹر میں ہو/ یا نجی سیکٹر میں

(3) ہر ادارہ اپنی کارکردگی کا معائنہ مرکزی حکومت/ ریاستی حکومت اور مرکزی علاقوں کے افسران اور وزارت کی مقرر کردہ ایجنسی کے ذریعے کرانے کا پابند ہے

بطور کلمۂ آخر اس سلسلے میں عرض کرنا ہے کہ اس مفید اسکیم سے رضا کار تنظیمیں اور غیر سرکاری ادارے بڑا فائدہ اٹھا سکتے ہیں چونکہ یہ اسکیم ایک خاص وقت کے لیے نہیں ہے اس لیے اس کے ذریعے صاحب صلاحیت افراد کو جز وقتی روزگار بھی مل سکتا ہے، میری فہم ناقص میں یہ آتا ہے کہ بڑے شہروں اور قصبوں میں رضا کار تنظیمیں ایک چھوٹی کمیٹی بنائیں جو مقامی ریٹائرڈ اساتذہ، سماجی کارکنوں وکیلوں، صحافیوں وغیرہ پر مشتمل ہو اور اس اسکیم کو چلانے میں تعاون کرے۔ تو اس پر عمل درآمد اچھی طرح ہو جائے گا۔ یہ ضروری ہے کہ حکومت کو کارگزاری کی رپورٹ اور آمد وخرچ کا حساب وغیرہ بروقت بھیجا جاتا رہے۔

□□□

پتہ:
Zahida Manzil
4/873, New Friends Colony,
Aligarh (U.P.)

ہمارا ای میل، آئی ڈی

Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

قومی اردو کونسل اور ماہ نامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر وتحقیق'' سے خط وکتابت بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔

محمد احتشام الحسن مجاہد

انگریزی میں مہارت

اردو طلبہ کے مسائل اور ان کا حل

ہندوستان میں بیرونی ممالک کی سرمایہ کاری اور خود اپنے ملک کی ترقی کی راہ پر دوڑ کی وجہ سے ہندوستان میں ملازمتوں کے مواقع بڑھ رہے ہیں جن کے واضح شواہد اخبارات کے اشتہارات اور انٹرنیٹ پر موجود جاب ویب سائیٹس ہیں۔ ملازمتوں کے کئی مواقع دستیاب ہونے کے باوجود اردو داں طبقے سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو ملازمتوں کے حصول میں مشکلات کا سامنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ کیا وجوہات ہیں جن سے اردو میڈیم سے بنیادی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان ملازمت کے حصول میں ان تھک دوڑ دھوپ کے باوجود ناکام ہو رہے ہیں۔ ملازمتوں کے حصول میں ان نوجوانوں کو پیش آنے والی کئی رکاوٹوں میں جو بنیادی رکاوٹ ہے وہ ''انگریزی'' ہے۔ ''انگریزی'' اردو میڈیم سے بنیادی یا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں اور اچھی تنخواہوں کے ساتھ آنے والی ملازمت کے درمیان ایک ایسی مضبوط دیوار ہے جس کو آسانی سے گرایا نہیں جا سکتا۔ جب کسی دیوار کو بہ آسانی منہدم نہیں کیا جا سکتا ہے تو سمجھداری اسی میں ہے کہ دیوار کو منہدم کرنے کے لیے اپنی توانائی صرف کرنے کے بجائے ان راستوں کو تلاش کیا جائے جن کے ذریعے سخت اور مضبوط دیوار کو عبور کیا جا سکے۔ ویسے تو ملازمتوں کے حصول کے لیے کئی بنیادی شرائط کی تکمیل ضروری ہے تاہم کسی بھی قسم کی ملازمت کے لیے انگریزی پر عبور لازمی جز ہے۔ اردو میڈیم کے طلبہ کے لیے یہ سنگین مسئلہ ہے کہ وہ انگریزی میں کہے جانے والے جملوں کو سمجھنے کے باوجود احساس کمتری کی وجہ سے انگریزی کے الفاظ کو اپنی زبان سے ادا نہیں کرتے۔ حالانکہ بنیادی جملوں کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انگریزی سیکھنے اور اس بیرونی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے آسان نسخوں کی تلاش سے قبل اردو میڈیم کے طلبہ کے ان نفسیاتی پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تو زیادہ سود مند ہوگا کیونکہ یہی وہ پہلو ہیں جو اردو میڈیم کے ہونہار طلبہ کو انگریزی میں مہارت کے حصول میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ اردو میڈیم کے طلبہ بھلے ہی وہ بنیادی تعلیم، انٹرمیڈیٹ، کالج یا یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کر چکے ہوں، انگریزی بولنے سے اس لیے ہچکچاتے ہیں کہ اطراف میں موجود افراد ان پر ہنسیں گے۔ واضح ہو کہ مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم اور انگریزی میں مہارت دو الگ نوعیتوں کی صلاحیتیں ہیں لہٰذا اردو میڈیم سے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اس بات کو اپنے ذہن سے نکال دیں کہ جو اردو سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتا ہے اس کا انگریزی میں ماہر ہونا ضروری ہے۔ ایسی چیز نوجوان نسل کو احساس کمتری کی طرف دھکیلتی ہے اور جب انسان ایک مرتبہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کی صلاحیتوں کو یہ سوچ دیمک کی طرح چاٹتی ہے۔ یاد رہے کہ بین الاقوامی سطح پر کئی ایسے کھلاڑی موجود ہیں جن کی مادری زبان انگریزی نہیں، وہ اپنی مادری زبان (چینی، روسی، جرمنی وغیرہ) میں ہی انٹرویو دیتے ہیں۔ اس بات کو ذہن نشین کر لیں کہ اعلیٰ تعلیم اور انگریزی میں مہارت دو مختلف محنتیں ہیں۔ دوسرے پڑاؤ پر اردو میڈیم کے ایسے طلبہ کی اکثریت ملتی ہے جو انگریزی سیکھنے کی جستجو میں لگی ہے لیکن ان کی محنتیں صحیح سمت سے عاری ہوتی ہیں۔ ایسے طلبہ کی اکثریت بھی ملتی ہے جو انگریزی سیکھنے کی جستجو میں ہے لیکن ان کی محنتیں صحیح سمت سے عاری ہوتی ہیں۔ ایسے طلبہ کی اکثریت پائی جاتی ہے جو کسی جملے کا خاکہ ذہن میں بناتے ہیں اور ان کی یہ سوچ اردو میں ہوتی ہے جسے وہ انگریزی کا لباس پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش انگریزی سیکھنے کی نہیں بلکہ اردو سوچ کو انگریزی میں تبدیل کرنے کی ہوتی ہے تو وہ نادانستہ طور پر مترجم بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مترجم بننا آسان نہیں۔ انگریزی کے اساتذہ انگریزی سیکھنے کے خواہشمند طلبہ کو سب سے پہلے اس غلط کوشش سے باز رہنے کی ہدایت دیتے ہیں۔ انگریزی سیکھنے کے خواہشمند حضرات پہلی فرصت میں اس کوشش کو ترک کریں کیونکہ مادری زبان کی سوچ کو انگریزی الفاظ کا لباس پہنانا انتہائی مشکل امر ہے۔ احساس کمتری اور اردو کی سوچ کو انگریزی لباس پہنانے سے گریز کرنے کے باوجود یہ سوال ہنوز باقی رہتا ہے کہ ''انگریزی کس طرح سیکھی جائے؟''

آج کے آئی ٹی دور میں کئی ایسے وسائل موجود ہیں جن کے ذریعے یومیہ زندگی میں کئی انگریزی الفاظ اور جملے سیکھے جا سکتے ہیں۔ انگریزی زبان سیکھنے کے لیے سب سے پہلے الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ کریں جس کو انگریزی اصطلاح میں "Vocabulary" کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے ''اردو سے انگریزی'' لغات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ گھریلو مشق یہ ہے کہ آپ گھر میں استعمال ہونے والی تمام اشیا کی فہرست تیار کر لیں۔ ان کے انگریزی نام یاد

کریں۔ پھر ان الفاظ کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں استعمال کرنا شروع کریں۔

انگریزی سیکھنے کے لیے ایک عام نسخہ ہر ماہر بتاتا ہے کہ آپ ٹی وی پر انگریزی خبریں دیکھیں اور انگریزی اخبارات، رسائل اور دیگر تحریری مواد کا مطالعہ کریں لیکن اکثر طلبہ کی یہ شکایت رہتی ہے کہ اس نسخے پر عمل کرنے کے باوجود خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن خبروں کا مشاہدہ یا جن مواد کا آپ نے مطالعہ کیا ہے اس کا آپ کو علم ہی نہیں۔ مثلاً انگریزی اخبار میں آپ نے ٹینس کی ایک خبر پڑھی کہ ''بلجیم کی عالمی نمبر ایک ٹینس کھلاڑی جسٹن ہینن ہارڈین نے یو ایس اوپن 2007 کے فائنل مقابلے میں روسی ٹینس خاتون کھلاڑی سویتلانا کوزنیٹسوا کو شکست دے کر عالمی خطاب حاصل کرلیا۔'' اگر آپ ٹینس کے کھیل سے واقف ہیں تو انگریزی میں تحریر عبارات آپ کی سمجھ میں آئیں گے اور اگر آپ کھیل کے ''الف، ب'' سے بھی واقف نہیں تو لمبی چوڑی عبارت پڑھنے کے بعد بھی آپ عبارت سے کچھ نہیں سیکھ سکتے۔ یہی وہ وجہ ہے کہ انگریزی خبریں سننے اور مواد کے مطالعے کے باوجود ہماری انگریزی بہتر نہیں ہوتی۔ لہٰذا کوشش اس بات کی کریں کہ انگریزی میں اس شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے مواد کا مطالعہ کریں جس کے بارے میں آپ اچھی طرح جانتے ہوں۔

انگریزی میں مہارت کے لیے ایک اور بھی آسان گھریلو مشق ہے اس مشق میں استقلال کی ضرورت ہوتی ہے جس کے جلد اور دور رس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ دنیا کی ہر زبان کے قواعد (گرامر) میں ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ دیگر 8 ٹینسس موجود ہیں۔ ان تمام ٹینسس کے مدنظر یومیہ زندگی کے امور کو انگریزی میں ظاہر کرنے کے لیے یومیہ کسی دو امور کا تحریری مواد تیار کرلیں۔ مثلاً ''پڑھنا'' ایک یومیہ کام ہے، اب اس لفظ پڑھنا (Reading) کو پہلے عام "Tenses" کے ڈھانچے میں ڈھالیں یعنی

I am Reading (i)

I was Reading (ii)

I will Read (iii)

اسی طرح انھیں ٹینس کے ذیلی استعمال میں ڈھالیں۔ اس مشق کے ذریعے آپ یومیہ 2 امور کے ذریعے 24 جملوں پر مہارت حاصل کرسکتے ہیں۔ جملوں کی یہ آواز بلند ادائیگی کے لیے آئینے کے سامنے خود کھڑے ہوکر ان جملوں کو دوہرائیں۔

انگریزی میں مہارت کے لیے مواصلاتی آلات کے لیے جن میں ریڈیو اور موبائل فون قابل ذکر ہیں، استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ موبائیل فون پر اکثر اطلاعات کیے جاتے ہیں کہ کمپنی کی جانب سے نئی پیشکش کی جارہی ہے اس طرح کے اطلاعات کی سماعت بندی، انگریزی اور علاقائی زبان میں کی جاسکتی ہے لیکن ان اطلاعات کو انگریزی میں ہی سنیں۔ علاوہ ازیں موبائیل فون ''کسٹمر کیئر'' کے نمائندوں سے انگریزی میں گفتگو کریں بھلے ہی آپ بہتر گفتگو نہیں کرسکتے لیکن آپ پر کوئی ہنسنے والا نہیں ہوتا ہے اور اس طرح کی متعدد کوششیں آپ کے لیے سودمند ثابت ہوں گی۔ دریں اثنا کمپیوٹر کے ذریعے بھی انگریزی سیکھی جاسکتی ہے۔ کمپیوٹر میں موجود اہم ایس ورڈ جو کہ دفتری امور کی انجام دہی کے لیے مائیکروسافٹ کمپنی کی جانب سے تیار کردہ ایک سافٹ ویر ہے۔ ایم ایس ورڈ میں آپ اپنی انگریزی تحریر کو بہتر بناسکتے ہیں جیسے مان لیجیے آپ نے ایم ایس ورڈ اوپن کرتے ہوئے ایک لفظ تحریر کیا "Dimonstration" جو کہ غلط ہے اس کو تحریر کرنے کے بعد جیسے ہی آپ کی بورڈ کے اسپیس بار کو دبائیں گے تبھی تحریر کردہ غلط لفظ کے نیچے ایک سرخ لکیر ظاہر ہوئی جو اس بات کی علامت ہے کہ جو لفظ آپ نے تحریر کیا ہے وہ غلط ہے۔ غلط الفاظ کی درستگی کا طریقہ ہے کہ اس لفظ پر ماؤس (Mouse) کا رائٹ کلک کریں تو اس لفظ کے قریبی صحیح الفاظ آپ کے مانیٹر پر ظاہر ہوں گے جس کے بعد آپ صحیح لفظ Demonstration کا انتخاب کرسکتے ہیں۔ اس طرح کی مشق سے آپ انگریزی املا کی غلطیوں کو دور کرسکتے ہیں۔ کمپیوٹر کے علاوہ انٹرنیٹ پر بھی کئی ایسے ویب سائٹ موجود ہیں جو باضابطہ انگریزی کی تعلیم فراہم کرتے ہیں ان میں قابل ذکر esl.about.com ہے جہاں ''انگریزی بطور دوسری زبان'' کے تحت کئی یونٹ موجود ہیں جن میں گرامر، ووکیبلری، تحریری سماعت، لب و لہجہ، تجارتی انگریزی قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں اس ویب سائیٹ پر ملازمت کے حصول کی تیاری کے لیے کافی سودمند مواد موجود ہے۔ یاد رکھیں زبان کا سیکھنا ایک بتدریج عمل ہے جس کے لیے محنت میں استقلال اور روزانہ مشق ضروری ہے جس کے بعد ہی ثمر آور نتائج کی امید کی جاسکتی ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ انگریزی سیکھنے کے لیے کسی بھی نامور ادارے میں داخلہ کیوں نہ لیں لیکن خود کی محنت جب تک نہ ہو اس وقت تک انگریزی پر عبور حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اس بات کو ذہن نشین کرلیں انگریزی آپ کو بولنا ہے لہٰذا ثمر آور نتائج کے لیے آپ کی محنت کی زیادہ ضرورت ہے۔

(بشکریہ ''سیاست''، حیدرآباد)

□□□

اسد فیض

سلیم اختر سے بات چیت

گذشتہ نصف صدی سے زائد پاکستانی اردو ادب کو جن ادبا، ناقدین نے اپنے رشحات قلم سے فیض یاب کیا ہے، ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر سلیم اختر کا بھی ہے۔ ان کی متنوع موضوعات پر لکھی گئی تقریباً ستر سے زائد کتب شائع ہوئی ہیں جو جامعات سے لے کر اعلیٰ مقابلہ جاتی امتحانات تک کتب حوالہ کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ گذشتہ دنوں ڈاکٹر صاحب سے ایک ملاقات میں ادبی موضوعات پر ان کے موقف کے حوالے سے ایک مکالمہ کیا گیا جس کی تفصیلات قارئین کی نذر ہیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب آپ کی پہلی کتاب کب چھپی اور اب تک کل کتنی کتب چھپ چکی ہیں؟

جواب: میں نے کم عمری ہی میں مطالعۂ کتب شروع کر دیا تھا، اسی طرح کم عمری ہی میں لکھنے کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ انبالہ شہر میں جب میں پانچویں یا چھٹی جماعت کا طالب علم تھا تب پہلی مرتبہ بچوں کے ایک رسالے میں میری کہانیاں چھپیں۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ 1951 تک پاکستان میں بچوں کے جتنے بھی معروف جرائد تھے ان میں میری کہانیاں مضامین اور نظمیں چھپتی رہیں۔ اسی دوران بچوں کی دو تین کتابیں بھی شائع ہو گئیں۔ ان میں سے دو کے نام اس وقت یاد آ رہے ہیں۔ ''سانپوں کا بادشاہ'' اور ''فلم کی کہانی'' بچوں کی کہانیوں اور کتابوں سے قطع نظر پہلی مطبوعہ کتاب آرلڈ بینٹ کی مشہور کتاب How to live on 24 hourse a day کا آزاد ترجمہ 1961 میں ''صبح کرنا شام کا'' کے نام سے شائع ہوا جب کہ طبع زاد تصنیفاتی مضامین کا مجموعہ ''عورت، جنس اور جذبات'' 1964 میں شائع ہوا۔ اسے حنیف رامے نے شائع کیا تھا۔ کل کتابوں کی صحیح تعداد تو یاد نہیں عمر کی مناسبت سے ستر یا بہتر کتب تو بن جاتی ہیں۔

سوال: آپ نے اپنے آپ کو کسی ایک صنف تک محدود کیوں نہیں رکھا اور اب آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ادب میں آپ کی پہچان کا وسیلہ کون سی صنف ہوگی؟

جواب: مجھے مختلف اصناف پر قلم اٹھاتے وقت کبھی دقت نہیں ہوتی کہ ہر نوع کا مطالعہ کر رکھا ہے اور ذہن میں اس ضمن میں خیالات واضح ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادب میں میرا بنیادی حوالہ تنقید کا ہے اور یہی میری پہچان ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب جدید افسانے کا دور ختم ہو گیا، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ علامت نگاری کے رجحان نے اردو افسانے کو نقصان پہنچایا ہے اور یہ تجربہ ناکام ثابت ہوا؟

جواب: اس سوال میں جدید کا لفظ اضافی ہے۔ میری رائے میں کبھی پریم چند، یلدرم اور نیاز فتح پوری جدید تھے پھر ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگار جدید بنے اور ان کے بعد علامت نگار۔ کل کو کسی اور انداز و اسلوب کا افسانہ جدید افسانہ کہلائے گا میں علامت نگاری کو مثبت رجحان سمجھتا ہوں اور اس کے اثرات قابل توجہ بھی ہیں۔ ہوا یہ ہے کہ بوجوہ علامت نگاری تحریک نہ بن سکی اور علامت نگاروں کا دبستان معرض وجود میں نہ آ سکا لیکن علامت کے ذریعے انسانی سائیکی کو جس طرح ایکسپلور (Explore) کیا گیا یا خارجی حقائق کی تلمیحوں اور ناگفتنی کے لیے جس طرح علامت کو استعمال کیا گیا وہ قابل قدر ہے۔ لہٰذا یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ علامت نگاری کا رجحان ختم ہو گیا، یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تجربہ ناکام ثابت ہوا۔

سوال: پاکستان میں کوئی اچھا ناول نہیں لکھا گیا اور نہ ہی ناول کی صنف نے یہاں فروغ پایا جب کہ انڈیا میں اچھے اردو ناول لکھے جا رہے ہیں؟

جواب: ہمارے ادبی خمیر میں غزل کی ریزہ خیالی شامل ہے۔ غالباً اسی لیے ناول سے ہمیں طبعی مناسبت نہیں۔ بڑا ناول لکھنے کے لیے بڑی تخلیقی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم دوستوفسکی، گورکی، ٹالسٹائی، سارتر اور مارلیز کہاں سے لائیں لہٰذا جو دال دلیہ میسر ہے اس کو غنیمت جانیے۔ انڈیا میں بھی قراۃ العین حیدر ہی نظر آتی ہیں وہاں بھی اردو کے مقابلے میں ہندی اور بنگلہ میں زیادہ بہتر ناول لکھے گئے ہیں۔

سوال: کیا ادب میں یہ نقاد کی اجارہ داری کا دور ہے اور معیاری ادب اردو میں تخلیق نہیں ہو رہا؟

جواب: دونوں باتوں کا آپس میں تعلق نہیں۔ نقاد کی اجارہ داری کبھی کسی بھی دور میں نہیں رہی۔ مزید یہ کہ معیاری ادب کی تخلیق کا نقاد کے قلم سے کوئی تعلق نہیں۔ تنقید اور تخلیق آزادانہ اور خود کار عمل ہیں۔ پہلے ادب تخلیق ہوتا ہے۔ اس کے بعد تنقید اس کی تحسین و تشریح کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔

سوال: کیا مغرب سے درآمد تنقیدی نظریات اور تصورات سے ہمارے ادب کی تفہیم ممکن ہے؟

جواب: ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری تنقید کی بنیاد ہی مغربی تصورات پر استوار ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کے ''مقدمۂ شعروشاعری'' (1893) سے اس رویّے کا آغاز ہوتا ہے۔ علوم کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ نت نئے تصورات نقد سے استفادہ کرنے کا رجحان قوی سے قوی تر ہوتا گیا۔ جب تک ہم اپنے ادب کے لیے خود اپنی بوطیقا کی تشکیل نہیں کرتے، ہم مغرب سے نظریات وتصورات کے اخذ وقبول پر مجبور ہیں۔ البتہ اس ضمن میں اتنی احتیاط لازم ہے کہ درآمدہ نظریات کو اندھے کی لاٹھی نہ بنایا جائے۔

سوال: کیا ادب کے تعین قدر کے لیے صرف نفسیاتی دبستان تنقید کافی ہے یا آپ کسی اور دبستان کے ذریعے ادب پارے کی تفہیم وتشریح کو اولیت دیں گے؟

جواب: جی نہیں! نفسیاتی دبستان تنقید سونٹھ کی گانٹھ نہیں۔ میں نے ادب پاروں کی تفہیم وتشریح کے ضمن میں نفسیات کی حدود اور امکانات کو مدِنظر رکھا۔ نفسیات سے اس وقت کام لیا جب تک وہ کام کی ثابت ہوسکتی تھی۔ جدید علوم اور ادب ونقد کے نظریات میں بہت وسعت اور تنوع ہے اور میں بقدرِ ہمت سب سے استفادے کا قائل ہوں۔ ذاتی طور پر نفسیاتی دبستان کے بعد مجھے مارکسی دبستان پسند ہے اور میں نے اس سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ عمرانی، تاریخی اور بعض دیگر علوم کا بھی اس ضمن میں نام لیا جاسکتا ہے۔ نقاد کی سب پر نگاہ ہونی چاہیے اور اسے لچک دار رویے کا حامل ہونا چاہیے کہ جسے بہتر خیال کرے اسے بروئے کار لائے۔

سوال: ادب اور تنقید لکھتے لکھتے آپ نے بنیاد پرستی کے موضوع پر ایک کتاب لکھ ڈالی، اس کے کیا محرکات تھے؟

جواب: یہ کتاب سب ہی کے لیے اچنبھا ثابت ہوئی کہ نفسیاتی تنقید اور جنسی افسانے لکھنے والا سلیم اختر بنیاد پرستی پر ایک تحقیقی کتاب بھی لکھ سکتا ہے۔ جہاں تک خیالات کا تعلق ہے تو میرے ہمیشہ سے یہی خیالات رہے ہیں اور علامہ اقبال پر لکھتے ہوئے میرے بعض مقالات میں ان کا اظہار ہو چکا تھا۔ ایک کانفرنس کے لیے بنیاد پرستی پر یہی مقالہ لکھتے ہوئے اندازہ ہوا کہ ضرورت اس موضوع پر ایک کتاب کی ہے۔ اس کتاب کے لیے میں نے کتنی ہی کتابیں خریدیں اور کتنی تو انائی اور محنت صرف کی یہ میں ہی جانتا ہوں لیکن اس کی پذیرائی میری توقع سے بڑھ کر ہوئی اور یوں میری محنت ٹھکانے لگی۔

سوال: کیا پاکستانی ادب کی الگ سے شناخت ممکن ہے اور اس کے اصل عناصر کیا ہیں؟

جواب: ذاتی طور پر میں پاکستانی ادب، اسلامی ادب، قومی ادب، ملی ادب، مقامی ادب، جیسی اصطلاحات کو درست تسلیم نہیں کرتا۔ ادب ادب ہوتا ہے اور بس۔ اسے ہوا بند ڈبوں میں پیک نہیں کیا جاسکتا۔ ہر بڑی تخلیق اور تخلیق کار جغرافیائی حدود بلکہ زمانی حدود سے بھی ماورا ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو ہم غیر ملکی ادیبوں کا مطالعہ بھی نہ کرتے۔ دوستوفسکی کو روسی، سارتر کو فرانسیسی اور ہمنگوے کو امریکی قرار دینے سے ان کی اہمیت کم ہوتی ہے اضافہ نہیں ہوتا۔

س: ڈاکٹر صاحب آپ نے اب تک جو تحقیقی کام کیا ہے اس کے بارے میں کچھ تفصیل بتائیں؟

جواب: ایمان داری کی بات یہ ہے کہ میں خود کو محقق نہیں سمجھتا اور نہ ہی میں نے ایسا دعویٰ کیا ہے۔ تاہم تحقیق کے نقطۂ نظر سے میرے کام کا جائزہ لیں تو ''اردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان'' جو میرے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے کا موضوع ہے، یہ بعد میں دو حصوں میں چھپا۔ پہلا حصہ نفسیاتی اور دوسرا حصہ ''مغرب میں نفسیاتی تنقید'' اس کے علاوہ میرے کچھ مقالات بھی تحقیقی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً ''تخلیق اور لاشعوری محرکات'' زیوس سے امیر حمزہ تک''، ''ادب میں نرگسیت'' جب کہ بہت سی تحریریں ایسی بھی ہیں جن میں تحقیقی حوالوں سے مواد جمع کیا گیا ہے۔

سوال: اردو تنقید کے معیار اور رفتار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہمارے ہاں تنقید میں تیز رفتاری نظر نہیں آتی بلکہ رفتار بے حد سست ہے۔ جہاں تک معاملہ ہے معیار کا تو یہ اب کلیشے بن گیا ہے کہ تنقید زوال پذیر ہے۔ کوئی ادیب یا شاعر نظر نہیں آتا جس کا انٹرویو شائع ہوا ہو اور اس نے ناقدین کو برا بھلا نہ کہا ہو اور ایسے الزامات نہ لگائے ہوں کہ ادب میں گروہ بندی ہے، مضافات کے ادیبوں کو پوچھا نہیں جاتا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ایسے شخص سے یہ پوچھا جائے کہ کیا تم نے پچھلے سال میں جو تنقید لکھی گئی ہے، وہ تمام پڑھی ہے اور اس کے اہم رجحانات کا علم ہے۔ اکثر کی ذہنی اوقات یہ ہوتی ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ جب کوئی یہ کہتا ہے کہ تنقید کا معیار گر گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خود اس پر تنقیدی مقالات نہیں لکھے جارہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں نقاد کا یہ کام سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ کتابوں کی تقاریب میں توصیفی مقالے پڑھے، اگر صرف اس پر مقالات لکھے جائیں تو تنقید کا معیار اونچا ہے وگرنہ نہیں۔ اگر آپ یہ نہیں کرتے یا سچ بولتے اور لکھتے ہیں تو آپ کی خیر نہیں۔ یہ ادب میں گنڈہ گردی کا دور ہے۔ میں لاہور میں رہتا ہوں، سب کی علمی اوقات جانتا ہوں، آپ کسی کے بارے میں سچ لکھ دیں تو لوگ گریبان پکڑنے تک آجاتے ہیں۔ ٹیلی فون پر گالیاں دی جاتی ہیں اور دھمکی آمیز خطوط ملتے ہیں۔ میں ان تمام مرحلوں سے گزر چکا ہوں۔ معاصرین پر جو لکھتا ہے وہ تو گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب زندگی کیا ہے اور اگر یہ آپ کو دوبارہ ملے تو اسے

کیسے بسر کرنا چاہیں گے؟

جواب: پاکستان کے منافق، کرپٹ، پرآلائش، خودغرض اور بے بنیاد معاشرے میں صاف ستھری زندگی بسر کرنا نائٹ میئر کے مترادف ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی میں نے خود کو نائٹ میئر میں پایا اور اب بھی یہی عالم ہے۔ میں خوب صورت خواب دیکھنے والا ٹین ایجر تھا۔ اس معاشرے نے مجھے قنوطی بنا کر میری سوچ کو منفی بنا دیا۔ اس معاشرے نے مجھ سے میرے خواب چھین لیے ہیں۔ دو افراد کی چند سیکنڈ کی لذت جس تیسرے فرد کو جنم دیتی ہے وہ بالعموم خسارے کی زیست بسر کرتا ہے۔ جنم پر اختیار نہ موت پر۔ فانی نے درست کہا تھا:

زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

اور سارتر نے کہا تھا: "Hell is other people" میرا بھی یہی حال ہے میں introvert تو تھا ہی اب مردم بے زار بھی ہو چکا ہوں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میرے احباب اسے کبھی نہ تسلیم کریں گے۔

سوال: بہ حیثیت ادیب و دانشور آپ پاکستان کے مستقبل کو کیسا دیکھتے ہیں؟

جواب: میں جین ڈکسن تو نہیں کہ مستقبل کی تصویر دیکھ سکوں لیکن میری کامن سنس مجھے یہ سمجھاتی ہے کہ پاکستان کا مستقبل بھی اس کے ماضی جیسا ہی ہوگا۔ وائٹ ہاؤس کے احکام کی باجبر دانشکرہ تعمیل، فوجی آمریت، فرعون صفت بیورو کریسی، عدل نا آشنا نظام، طالع آزما لیڈر، کھانے پینے والے سیاستداں، رشوت، کرپشن، اقربا نوازی، امارت اور غربت کے مابین خلیج، جمہوریت کی قبا میں آمریت، مذہبی تفرقہ اور تشدد، جی خوش ہوا یا مزید بھی کچھ کہوں۔

سوال: پاکستان میں اقبال شناسی کے حوالے سے کیے گئے کام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: تشریحی انداز، کلاس نوٹس، تکرار، تو ارو براہ راست مطالعے کے بغیر مغربی فلاسفروں کے حوالے، بے جان اسلوب ذاتی رائے کے اظہار سے عمومی اجتناب، کلیشے، تازہ نگاہی کا فقدان، محاوریت۔

سوال: کیا سرکاری سطح پر قائم ادبی ادارے اپنے فرائض احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں؟

جواب: سرکاری اداروں کے مقاصد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں بالآخر وہ کتابیں چھاپتے ہیں۔ یقیناً یہ تو ہو ہی رہا ہے۔ میرا ایک دو اداروں سے تعلق رہا ہے۔ میں اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ادارہ فعال نہیں تو اس کا سبب اس کا سرکاری ہونا ہے۔ کلرک نے فائل دبالی، متعلقہ سکریٹری نے گرانٹ میں کٹوتی کرلی۔ گرانٹ کا وقت پر نہ ملنا اس طرح کے ان اداروں کے متعدد مسائل ہوتے ہیں۔ مجھے تو اس پر تعجب ہے کہ نامساعد حالات میں بھی یہ ادارے کچھ کام کر لیتے ہیں۔ □□□

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعرو ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں ''پس نوشت: آج یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت -/228 روپے

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرّہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت: -/216 روپے

سیّد جعفر محمود

(ہماری مطبوعات سے)

توانائی کے غیر رسمی وسائل

دور دراز اور الگ تھلگ واقع دیہاتوں میں خوشیاں لانے کے لیے ہندوستان سورج کو زمین پر اتار لایا ہے اور ان دیہاتوں کو بجلی اور پانی فراہم کرا دیا ہے۔ شمسی توانائی سے بجلی پیدا کرنے کے معاملے میں ہندوستان نے جو جست لگائی ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں مختلف النوع نظامات کو فروغ دیا گیا ہے اور پینے کے پانی سے لے کر انارکٹیکا مہم پر جانے والی پہلی ہندوستانی سائنٹفک ٹیم کو نفیس نوعیت کا پاور پیک فراہم کرایا گیا ہے۔ شمسی توانائی کے میدان میں جو ریسرچ اور کوششیں کی گئی ہیں ان کا رخ دونوں جانب یعنی شمسی حرارتی استعمال اور بلاواسطہ طور پر شمسی بجلی کے تحفظ کی طرف رہا ہے۔ ہندوستان کے لیے شمسی توانائی کے استعمال کی بہت اہمیت ہے کیونکہ یہ ملک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں منطقہ حارہ کا سا موسم ہوتا ہے اور سال کے بیشتر حصے میں دھوپ فراوانی سے پڑتی ہے۔ 1979 تک ہندوستان میں شمسی فوٹو وولٹائک سیل کے میدان میں صرف اتنا کام ہوا کہ چند قومی پائے کی تجربہ گاہوں میں ریسرچ صرف شمسی سیلوں پر مرتکز رہی اور صرف اتنی ترقی ہو پائی کہ تجربہ گاہ کی حد تک شمسی سیل تیار کر لیے گئے اور وہ بھی خاص طور پر خلائی پروگراموں کے لیے۔ 1979 کے آخر میں حکومت نے شمسی توانائی وسائل کو فروغ دینے، ریسرچ اور عملی مظاہرہ کرنے کے لیے ایک قومی پروگرام کی شروعات کی۔ اس میدان میں بتدریج دلچسپیاں بڑھتی چلی گئیں اور شمسی سیل سے لے کر شمسی فوٹو وولٹائکس تک اور خالصتاً سائنٹفک ریسرچ سے لے کر تکنیکی اور انجینئرنگ مشاغل تک یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ پبلک سیکٹر کی الیکٹرانک کمپنیوں اور مختلف ریسرچ تجربہ گاہوں اور تعلیمی اداروں کی سرگرمی سے حصہ لینے کی وجہ سے اس ضمن میں متعدد طور پر ریسرچ فروغ، مصنوعات کی تیاری، مصنوعات کا استعمال، عملی مظاہرہ کرنے، تعلیم اور ٹریننگ فراہم کرانے کا کام انجام دیا گیا، جہاں ایک طرف تعلیمی اداروں میں شمسی سیلوں اور شمسی سامان پر ریسرچ کی گئی وہیں دوسری طرف پبلک سیکٹر کمپنیوں میں ان سے بننے والی چیزوں کے مشاغل کو فوقیت دی گئی۔

چھٹے منصوبے میں توانائی کے نئے اور قابل تجدید وسائل کے میدان میں انجام دیے جانے والے مشاغل اور تجویز کے کام میں نمایاں اضافہ دیکھنے کو ملا۔ اس میدان کے لیے مقرر کردہ کمیشن فار ایڈیشنل سورسیز آف انرجی نے دیہی اور شہری علاقوں کے لیے شمسی حراری منتقلی سے متعلقہ بہت سے مشغلوں کی کفالت کی۔ دو تم کے شمسی کلکٹروں کو فروغ دیا گیا اور پھر ان سے متعلقہ معلومات صنعتوں کو منتقل کر دی گئی۔ بخ اثرات پیدا کرنے کے لیے ایک مناسب شمسی توانائی بوسٹیڈ حراری پمپ تیار کرلیا گیا ہے اس میدان میں عملی مظاہرہ اور آزمائشی پروگرام کے تحت کچھ نظامات فروغ دے لیے گئے ہیں۔ جیسے کہ آبی ہیٹر اور ڈرائیئرس چوب کمانے کے نظامات پمپ نصب کیے جارہے ہیں، شمسی کوکروں کے کئی ماڈل تیار کر لیے گئے ہیں۔ ان کو کوکروں میں سادہ قسم کے حراری بکس نما شمسی کوکر بھی ہیں جن میں ایک ہی رفلیکٹر لگا ہوتا ہے اور شمسی چولہے بھی ہیں جن میں کئی کئی رفلیکٹر لگے ہوتے ہیں، ان کے علاوہ شمسی ارتکاز کار بھی تیار کیے گئے ہیں۔ آنے والے زمانے میں تیزی سے ترقی کرتی ہوئی جس شمسی تکنیک سے توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں وہ ہیں شمسی سیل۔ شمسی سیل بہت زیادہ خالص سلی کن سے تیار کیے ہوئے ایسے چپٹے دھاتی ''نیلے'' ورق نما ٹکڑے (Chips) ہوتے ہیں جو سورج کی روشنی کو بجلی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ حالانکہ سلی کن دنیا کے ہر ایک ملک میں فراوانی سے پائی جاتی ہے مگر اس کو 99.9 فیصد حد تک خالص بنانے کی ترکیب بے حد پیچیدہ بھی ہے اور بے حد مہنگی بھی۔ اسی وجہ سے عام سیل کے مقابلے شمسی سیل 10 تا 15 گنے مہنگے ہوتے ہیں۔ فوٹو وولٹائک نظام کا قلب اس شمسی سیل کا بنا ہوا ہوتا ہے جسے عام طور پر اعلیٰ تخلیص شدہ سلی کن کے یک قلمی پانی سے تیار کیا جاتا ہے بے شکل سلی کن فلمس کی طرح کثیر قلمی سلی کن ورقیوں کی طرح کے شمسی سیل بھی تیار کر لیے گئے ہیں، ان سیلوں کو حسب منشا وولٹج اور برقی شرحوں کے حصول کے لیے سلسلے وار متوازی انداز میں جوڑ کر غلاف بند کر دیا جاتا ہے اور Modules کی شکل دے دی جاتی ہے۔ ان کو آپس میں جوڑ کر پینل اور قطاریں بنا کر کسی بھی کام

''آزادی کے بعد سے سائنس، ٹیکنالوجی اور ترقی'' سے ماخوذ از سیّد جعفر محمود، مترجم: سیّد مرغوب احمد
صفحات 221، قیمت : -/80 روپئے
نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

کے لیے مطلوبہ قوت حاصل کرلی جاتی ہے۔ آسانی، بھروسہ مندی اور متحرک حصوں کی عدم موجودگی سے سب رکھ رکھاؤ پر ہونے والے کم خرچ کے مدنظر فوٹو وولٹائک تکنیک کی افادیت اظہر من الشمس ہے۔ اسی لیے فوٹو وولٹائک نظام کی تنصیب دیہی اور دور دراز کے علاقوں میں نہایت موزوں رہتی ہے اور اس سے وہاں مختلف کام لیے جاسکتے ہیں جیسے چھوٹے پیمانے پر آب پاشی کرنے کے لیے پمپ کے ذریعے پانی نکالنا، پینے کا پانی حاصل کرنا، گلی کوچوں میں روشنی کرنا، مائکرو ویو ریپیٹر اسٹیشنوں کو چلانے کے لیے پاور فراہم کرنا، ریڈیو، ٹی وی اور اجتماعات میں استعمال ہونے والے آلات کے لیے بجلی فراہم کرانا۔

ہمارے ملک میں پانچویں منصوبے میں فوٹو وولٹائک تکنالوجی پر کام شروع ہوا۔ IITs اور قومی تجربہ گاہوں میں کئی R&D Project شروع کیے گئے۔ سینٹرل الیکٹرانکس لمیٹڈ میں سستی شمسی سیل تکنالوجی پر اہم پروجیکٹ شروع کیا گیا۔ چھٹے منصوبے کے شروع میں شمسی سیل اور modules کی بنیادی تکنیک فروغ دی گئی اور ارضی استعمال کے لیے چند نظامات کی ڈیزائن کاری کی گئی۔ اسی نشو ونما کی بنا پر چھٹے منصوبے کے دوران ابتدائی پیمانہ کی پیداوار اور عملی مظاہرے پر مشتمل ایک خاص R&D پروگرام شروع کیا گیا۔ یہ تکنیک لازماً روایتی اور پختہ نیم موصل پروسیس صنعت پر مبنی ہے۔ شمسی فوٹو وولٹائک نظام کی تکنیک اور انجینئرنگ کے فروغ دینے کا مشغلہ چار بنیادی میدانوں میں انجام دیا جاسکتا ہے۔ ان میدانوں میں بنیادی کچے مال کو فروغ دینا (خصوصاً سلی کن)، شمسی سیل اور پرزوں کے نظام کا ماڈیولی توازن (modules balance of components systems) اور مکمل انجینئرنگ نظام شامل ہے۔

ڈیپارٹمنٹ آف نان کنوینشنل انرجی سورسیز پر شمسی فوٹو وولٹائک تراکیب کو فروغ دینے، تیار کرنے اور استعمال میں لانے کی ذمے داری عائد کی گئی ہے۔ موافق شمسی اشعاع ریزی کے حالات اور لامرکزی استعمال کے لیے برقی توانائی کی بہت زیادہ ضرورت کے مدِنظر شمسی توانائی کے استعمال کی راہ بڑی جاذب نظر دکھائی دیتی ہے۔ تنصیب میں آسانی، رکھ رکھاؤ کے خرچ سے مبرا شور اور آلودگی اور طویل مدت تک کام آنے والے فوٹو ولٹائک نظامات، دور دراز اور الگ تھلگ جنگلاتی، پہاڑی اور ریگستانی علاقوں میں استعمال کرنے کے لیے نہایت موزوں اور بہتر رہتے ہیں۔

اب تک جو ٹیکنالوجی ہم فروغ دے پائے ہیں اس کا تعلق خاص طور پر واحد قلمی سلی کن شمسی سیلوں میں تبدیل کرنے اور مختلف نوعیت کے کام کاج کے لیے ان کی ڈیزائن کاری کرنے سے ہے۔ مصنوعات تیار کرنے میں کام آنے والے سیل اور ماڈل کی ڈیزائن کاری کے لیے کئی نئی تکنیکیں اور اصلاحات اختیار کی گئی ہیں۔ اس میں جو چیزیں شامل ہیں وہ ہیں: سامنے اور پشت کے تماسوں کی اسکرین پرنٹنگ پالش کرنا اور بافت کاری پالش کرنا، آزمائش اور غلاف چڑھانا جس سے تیاری پر آنے والی لاگت میں کمی آجائے۔ CEL نے اسکرین پرنٹنگ کے لیے سلور پیسٹر تیار کرلیا ہے۔ اسی دوران ایک دوسری پبلک سیکٹر اکائی بھارت ہیوی الیکٹریکلس لمیٹڈ نے گھریلو تکنیک پر مبنی سامان تیار کرنے کا پروگرام شروع کیا ہے۔ CZ ویفروں کو استعمال کرکے CEL اور BHEL کو اوسط سیل کی کارکردگیوں میں 10 تا 11 فیصد تک اضافہ کرنے میں کامیابی ملی ہے۔ نیم قلمی ویفروں کو استعمال کرکے کچھ تجرباتی کام بہرحال چل رہا ہے۔ اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہے اس کا استعمال کرکے ملک کو اس قابل بنا دیا جانا چاہیے کہ اس کے ہاتھ ایسی تکنیک اور آلات لگ جائیں جو اس قسم کے سامان کو فروغ دینے میں مطلوب ہوتے ہیں۔

نیشنل فزیکل لیباریٹری کے سائنس دانوں نے کیڈمیم سلفائڈ اور کاپر سلفائڈ (CdS اور :CuS) شمسی سیل تیار کرنے کی تکنیک فروغ دے لی ہے۔ یہ سیل اس طرح تیار کیے جاتے ہیں کہ عام کھڑکی کے شیشے کے خامری معمول پر کیمیاوی عمل اور خلائی تہہ نشینی بروئے کار لاکر کثیر قلمی شکلوں میں نیم موصلی پرتیں چڑھادی جاتی ہیں۔ انھیں مکمل طور پر ملفوف یا کیپسول میں بند کردیا جاتا ہے تاکہ موسمی تغیرات کا ان پر کوئی اثر نہ پڑسکے۔ تکنیک کی صنعت کاری اور پروسیس متغیرات پر قابو حاصل ہوجانے کے عمل کی باریکی سے جانچ پڑتال کرنے کے لیے تجربہ گاہ کی سطح تک سامان تیار کرنے کی سہولت قائم کرلی گئی ہے۔ 5-6 فیصد کی وسعت تک منتقلی صلاحیت (conversion efficiency) کے حامل کئی سو سیل تیار کرلیے گئے ہیں۔ ان سیلوں نے کئی برسوں تک غیر معمولی استحکام کا مظاہرہ کیا ہے۔

NPL نے شمسی کلکٹروں کی حراری کارکردگی کی جانچ کرنے کی سہولیات بھی فروغ دی ہیں۔ شمسی کلکٹروں کی حراری کارکردگی ٹیسٹ کرنے کی اور معیاری کلیکٹنگ کے حوالہ سے کلکٹر کے تقابلی جانچ کرنے کی سہولیات بھی قائم کی گئی ہیں۔ تجربات کے ذریعے کارکردگی کی پیمائش کے علاوہ دیگر طبعی پیرامیٹروں کو معلوم کرنے کی سہولیات بھی موجود ہیں جیسے انعطاف نما اور گلیکسنگ کی انجذاب کی شرح، پشت اور انتہائی سرے کے جز کی حراری موصلیت۔ ان باتوں کو استعمال کرکے اور ڈیزائن پیرامیٹروں کو معلوم کرکے نظریاتی شرح معلوم کی جاسکتی ہے۔ چھٹے منصوبے کے دوران DNES نے R&D، ابتدائی طور پر مصنوعات تیار کرنے اور PV ٹیکنالوجی سے متعلق عملی مظاہرہ کرنے کا قابلِ شمول (comprehensive) پروگرام شروع کیا۔ اسی پروگرام کے نتیجے میں سامان تیار کرنے کی دیسی تکنیک مصنوعات تیار کرنے کے لیے ذیلی ڈھانچے PV نظامات کی دیکھ ریکھ اور تنصیب جیسی چیزیں فروغ پاتی چلی گئیں

اور ان چیزوں کو استعمال کرنے والے لوگوں میں بیداری پیدا ہوتی چلی گئی۔

1986 میں تامل ناڈو کے میتور علاقے میں خالص سلی کن پیدا کرنے کا ایک دیسی پلانٹ لگایا گیا۔ اس پلانٹ میں سالانہ 25 ٹن کثیر قلمی سلی کن تیار کیا جاتا ہے اور اس کے ایک حصے کو واحد قلمی ingots اور ویفروں میں تبدیل کیا جاتا ہے۔۔۔ یہ چیز ان شمسی سیلوں اور الیکٹرانی آلات کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے کہ جو دھوپ کو بجلی میں منتقل کر دیتے ہیں۔

دیسی ترکیب میں اعلیٰ طور پر خالص سلی کن ٹیٹرا کلورائڈ کچے مال کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ جب اس کا تعامل ہائیڈروجن گیس سے کرایا جاتا ہے تو ہائیڈروجن STC کو دھاتی سلی کن میں تحلیل کر دیتی ہے۔ پھر اس دھاتی سلی کن کو ایک دوہرے خول والے ریاکٹر میں موجود U کی شکل والے گرم ٹنگسٹن فلامینٹ پر جمع کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اس پلانٹ پر جو سلی کن تیار کیا جاتا ہے اس کی قیمت 750 اور 850 روپے فی کلوگرام بیٹھتی ہے جو درآمد شدہ سلی کن کی قیمت کے مقابلے کہیں کم ہوتی ہے۔ یہ سلی کن پروجیکٹ، میتور کیمیکلس اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کے دو سائنس دانوں کے 15 برس کے مسلسل اشتراک کے بعد وجود میں آیا ہے۔ یہ دو سائنس داں ہیں: پروفیسر سی۔ سورین، جو ایک ماہر طبیعیات ہیں اور پروفیسر اے۔ آر۔ واسو دیو مورتھی، جو نہ صرف ایک مشہور کیمیا داں ہیں بلکہ انھیں ہندوستان میں بابائے سلی کن انڈسٹری بھی تصور کیا جاتا ہے۔

امارفس یا بے شکل سلی کن پر جو متحدہ پروگرام چلایا گیا وہ مستحکم انداز میں ترقی کرتا چلا گیا۔ انڈین ایسوسی ایشن فار کلٹی ویشن آف سائنس کلکتہ، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، دہلی اور پونا یونیورسٹی میں تجرباتی کام کے لیے پلازما جمع کرنے کی سہولیات موجود ہیں۔ سائلین گیس امارفس سلی کن تیار کرنے کے لیے ایک اہم ان پٹ ہوتی ہے اس گیس کو کم مقدار میں IIT کھڑگپور اور IISc بنگلور میں تیار کیا جارہا ہے اور اس کی کوالٹی کی جانچ کی جارہی ہے۔ PV کے دیگر پہلوؤں فوٹو الیکٹرو کیمیکل شمسی سیل، مہین فلم تراکیب جیسے سسٹمس کو فروغ دینے کا کام کئی اداروں میں چل رہا ہے۔ DENES اس بات کی کوشش میں لگا ہوا ہے کہ دیسی طور پر تیار کی جانے والی سلی کن کو ترقی دی جائے اور باریک بینی سے اس کی جانچ کی جائے اور PV تیار کرنے کے لیے اس کی suitablility کی تحسیب کی جائے۔ اس قسم کے مادوں سے جو شمسی سیل اور ماڈیولس بنائے جاتے ہیں وہ کارکردگی کے لحاظ سے درآمد شدہ سلی کن سے تیار شدہ آلات کے مماثل ہوتے ہیں۔

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، کھڑگپور کے محققین ایسے طریقوں پر کام کر رہے ہیں جنھیں اختیار کر کے زرعی فضلوں کو ہائی ٹیک توانائی فراہم کرانے والی اشیا میں تبدیل کر دیا جائے۔ ان لوگوں نے یہ پتہ لگایا کہ چاول کی بھوسی میں 18% سلی کا ہوتی ہے۔ جسے عرف عام میں سفید راکھ کہا جاتا ہے۔ اب یہ سائنس داں سلی کا کو عمدہ دانے دار سلی کن میں تبدیل کرنے کے سستے طریقے معلوم کرنے کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔ اس وقت ہمارے ملک میں شمسی سیل اور ماڈیولس تیار کرنے کے دو پروگراموں پر عمل کیا جارہا ہے۔ ایک تو سینٹرل الیکٹرانکس لمیٹڈ میں اور دوسرا BHEL میں چلایا جارہا ہے، جہاں IMW تیاری کی گنجائش موجود ہے۔ اکتوبر 1980 میں 11.97 کروڑ روپے کی لاگت سے ایک پنج سالہ نیشنل سولر فوٹو وولٹائک انرجی ڈیمانسٹریشن پروگرام شروع کیا گیا۔ جس پروگرام کی منظوری مئی 1981 میں CASF نے دی تھی اس کی رو سے اس برس کے اختتام تک IMW کی سطح تک ابتدائی پیمانے کی پیداواری سہولیات فراہم کرائی جانی تھیں۔ جیسے مختلف طور پر استعمال کرنے اور عملی مظاہرہ کرنے کے لیے PV نظامات فروغ دینا/عملی میدان میں آزمائش کے لیے ان نظامات کو فروغ دینا، باریک بینی سے جانچ پڑتال کرنے کے لیے اور مقبول بنانے کے لیے ان نظامات کو فروغ دینا۔ موجودہ پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے اور ہندوستانی حالات میں PV توانائی کی بقا اور نشو و نما کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے پروگرام چلایا جائے گا۔ اس وقت ہمارے ملک میں شمسی سیل اور ماڈیول تیار کرنے کے دو پروگرام چلائے جارہے ہیں، ان میں سے ایک پروگرام سینٹرل الیکٹرانکس لمیٹڈ میں چلایا جارہا ہے جہاں مارچ 1984 کے اختتام تک پیداواری صلاحیت 600 kw سالانہ تک پہنچ چکی تھی۔ NASPED کے تحت پچھلے دو تین برسوں کے دوران پیداوار، اصل متعین شدہ پیداوار سے تقریباً زائد از چھ ماہ پیچھے چل رہی ہے۔ 1983-84 کے دوران CEL میں پیداوار کا حدف 150 kw تھا مگر یہ پیداوار اب تقریباً 115 kw تک ہونے کی امید ہے۔ 1984-85 کے دوران 400 kw کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا جو اصل میں ستمبر 1983 تا اکتوبر 1984 کی درمیانی مدت کا ہدف تھا۔ پیداوار کی کمی کے مختلف اسباب بیان کیے گئے جیسے نئی پروسیس تکنیکوں کو فروغ دینے اور انھیں پیداوار پر نافذ کرنے میں پیش آنے والی مشکلات اور کچے مال کی کمی، نئی عمارت میں منتقل ہونے کے سبب تقسیم کا متاثر ہونا وغیرہ۔ سلی کن ویفروں کی شدید کمی کے باعث 1983-84 میں سامان تیار کرنے کے عمل میں کافی رکاوٹ پیدا ہوئی۔ اس کمی کے دو اسباب تھے، اول یہ کہ عالمی منڈی میں خالص سلی کن کی کمی واقع ہوئی دوم یہ کہ 1983-84 کی درآمد پالیسی کے مطابق سلی کن ویفروں کو درآمد کرنے کے لیے آٹومیٹک او رمعاون لائسنس طریقہ کار کے تحت لائسنس کی ضرورت پڑتی تھی۔ اب تک NASPED کے تمام تجربات کو مدِ نظر رکھنا ہوگا اور ستمبر 1988 تک IMW کی سطح تک سامان

تیاری کا حدف حاصل کرنے کے لیے سخت کوششیں کرنی ہوگی۔ سامان کی تیاری کا دوسرا پروگرام ایک دوسرے پبلک سیکٹر کے مرکز BHEL پر چلایا جارہا ہے اور اس کا ہدف 1988 تک 250 kw تک مقرر کیا گیا ہے۔

ڈپارٹمنٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی اینڈ DNES اب تک تقریباً 40 عدد R&D پروجیکٹوں کو مالی تعاون فراہم کراچکے ہیں۔ ان پروجیکٹوں کا تعلق سیل بنانے کے لیے مختلف اشیا فراہم کرانے، نظامات کو فروغ دینے اور نسبتاً نئے قسم کے سیلوں کو مرتکز کرنے سے ہے۔ اب تک CdS, CuS سیلوں سمیت مہین فلم شمسی سیلوں کی تیاری اور باریک بینی سے تجزیہ کرنے کے کام پر تفصیلی کھوج بین اور تلاش وجستجو کا کام کیا جاچکا ہے۔ چاول کی بھوسی سے سلی کن اور فلزکاری گریڈ کی سلی کن حاصل کرنے کا کافی کام کیا جاچکا ہے اور نتائج کافی ہمت افزا برآمد ہوئے ہیں۔ 50mm قطر کے کثیر قلمی ان گوٹ ڈھالنے کی تکنیک فروغ دی جاچکی ہے۔ اور اب ان کا سائز بڑھانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ حال ہی میں امارفس سلی کن ٹیکنالوجی کا ایک متحدہ پروگرام وضع کیا گیا ہے او رپانچ پروجیکٹوں کو منظوری دے دی گئی ہے۔ جن میں سے دو پروجیکٹ سیلائن پری پریشن پر ہیں۔ DNES نے فوٹو الیکٹروکیمیکل شمسی سیلوں کے کئی پروجیکٹوں کو فنڈ فراہم کرایا ہے۔

NASPED کے پروگرام میں کئی پرزوں یا آلات کے کام کرنے کا عملی مظاہرہ اور عملی آزمائش بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ ساحل سمندر سے دور واقع پلیٹ فارموں تک پانی پہنچانے، اجتماعی ریڈیو اور ٹی وی سیٹ اور اسٹریٹ لائٹ اکائیاں بھی فروغ دی جاچکی ہیں او ران کا عملی مظاہرہ ملک کے مختلف حصوں میں کیا جاچکا ہے۔ CEL نے 100 سے زیادہ شمسی پمپ اور 50 دیگر نظامات فراہم کرائے ہیں۔ یہ پمپ چھوٹے پیمانے پر آبپاشی کرنے، پینے کا پانی فراہم کرنے اور دیگر عملی مظاہرے کرنے اور ٹریننگ فراہم کرانے کے مقاصد سے استعمال کیے جارہے ہیں۔

حال ہی میں PV ٹیکنالوجی کو بروئے کار لاکر دیہاتوں میں بجلی فراہم کرانے کے کام پر اولین تجربات شروع کیے گئے ہیں۔ آندھراپردیش کا سلیجی پلی ملک کا پہلا ایسا دیہات ہے کہ جہاں شمسی فوٹو وولٹائک نظامات کے ذریعے بجلی فراہم کرائی گئی ہے۔ یہاں نومبر 1983 سے 7.5 kw پاور سپلائی نظام کام کررہا ہے۔ تامل ناڈو کے قبائلی دیہاتوں میں عنقریب اسٹریٹ لائٹ اور دیگر اکائیاں نصب کرنے کی تجویز پاس کی گئی ہے۔ اسی قسم کی تنصیبات جموں اور کشمیر اور کرناٹک میں بھی قائم کرنے کے سلسلے میں کھوج بین کی جارہی ہے۔

ایک سرکاری سروے کے مطابق ہمارے ملک میں بحری حراری توانائی کی منتقلی کی بہترین صلاحیت موجود ہے اور سرزمین ہند اور اس کے قریبی جزائر جیسے لکش دیپ، انڈمان ونکوبار۔ پر دنیا کے بہترین علاقے موجود ہیں۔ ہندوستان میں کل OTCE صلاحیت اندازاً 50,000 MW سے بھی زیادہ حاصل کی جاسکتی ہے جو اب تک تنصیب شدہ پاور پیداوار کی تقریباً 153% ہے۔ اس ضمن میں IIT، مدراس ملک کی دیگر قومی تنظیموں کے اشتراک سے ایک پروجیکٹ شروع کررہا ہے۔ دیگر قابل تجدید وسائل بھی موجود ہیں جیسے پن بجلی، بحری توانائی، ارض حراری توانائی، ہمارے ملک میں ان تمام میدانوں میں پروگرام شروع کیے گئے ہیں تاکہ اس میں بھی کامیابی حاصل کی جاسکے اور ملک پر ان قابل تجدید ذرائع کے نمایاں اثرات مرتب ہوسکیں۔ یہ ضروری ہے کہ ان میدانوں میں نہ صرف یہ کہ سرکاری تعاون سے پروگرام چلائے جائیں بلکہ دیگر صنعتوں اور رضاکار اداروں اور دیگر تنظیموں کو بھی ملوث کیا جائے۔ شمسی حراری نظامات یا دیگر تراکیب کی تنصیب کے لیے مرکزی حکومت مالی مدد فراہم کراتی ہے۔ اجتماعی شمسی کوکروں کے لیے صد فی صد اور فیملی کوکروں کے لیے 33.3% مالی امداد دی جاتی ہے۔ شمسی فوٹو وولٹائک واٹر پمپ کا نظام اور کمیونٹی لائٹنگ نظام ریاستی حکومت اور دیگر اداروں کو 25000 روپے کی امدادی قیمت پر فراہم کرایا جاتا ہے۔ کچھ ریاستی حکومت اور مرکز کے زیراہتمام علاقے بھی مختلف شمسی آلات پر امداد فراہم کراتے ہیں۔

سادہ اور سستے طریقوں سے توانائی پیدا کرنے کے لیے ہندوستانی سائنسدانوں نے بائیوگیس پلانٹ کے کئی ڈیزائن تیار کیے ہیں۔ ان پلانٹوں میں مختلف قسم کے زراعتی فضلے استعمال کیے جاتے ہیں جیسے گوبر، انسانی فضلہ، نباتاتی فضلے، سمندر سوکھ (جل کمبھی)۔ ان فضلوں کو استعمال کرکے نہ صرف یہ کہ گیس کی شکل میں ایندھن حاصل ہوجاتا ہے بلکہ نہایت عمدہ قسم کی دیسی کھاد بھی حاصل ہوتی ہے۔

مختلف ریسرچ اداروں پر ایک درجن سے زیادہ ڈیزائن تیار کیے گئے ہیں۔ ان تمام ڈیزائنوں میں یا تو ڈائجسٹروں کی شکل میں تبدیلیاں کی گئی ہیں یا گیس ہولڈروں میں۔ بائیوگیس کے ضمن میں کی جانے والی تحقیق اور فروغ کی کوششوں سے فائدہ مند نتائج برآمد ہوئے ہیں جیسے فکسڈ ڈوم بائیوگیس پلانٹ تیار ہوئے ہیں، فیروسیمنٹ ڈائجسٹر فروغ دیے گئے ہیں، بائیوگیس ٹیکنالوجی میں کامیابی سے FRP کو شامل کردیا گیا ہے اور اسٹیل ہولڈروں کو بدل دیا گیا ہے، مختلف زرعی، موسمی حالات جیسے اردگرد کا درجۂ حرارت پر مبنی بائیوگیس کی ڈیزائن کاری کرکے ان کی کارکردگی میں اضافہ کیا گیا ہے اس کے نتیجے میں انھیں تعمیر کرانے کی لاگت کم ہوئی ہے، بائیوگیس کے ایسے سستے ڈیزائن تیا رہوئے ہیں کہ جن میں سیمنٹ بھی کم استعمال ہوتا ہے اور چنائی بھی زیادہ نہیں کرنی پڑتی۔ یہ تمام باتیں یقیناً اہم کامیابیاں قرار دی جاسکتی ہیں اور خصوصی طور

پر ان کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔

سائنسدانوں نے ایسے بائیو گیس پلانٹ بھی تیار کیے ہیں کہ جن میں مختلف قسم کی چیزیں چارے کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں، جیسے نائٹ سوئیل جل کھمبی، زرعی فضلے جن میں کیلوں کے تنے، ارنڈی کی کھلی، ولو برادہ اور بچی کچی غذا جیسی چیزیں بھی شامل ہیں۔ اس ضمن میں دیگر کامیابیاں بھی ملی ہیں جیسے یہ کہ ارنڈی کی کھلی اور دیگر خوردنی فضلوں اور باقیات سے بائیو گیس تیار کرنے کے لیے خصوصی اور بہتر قسم کے خورد حیاتیاتی کلچروں کو فروغ دیا گیا ہے۔ جہاں ایک طرف ایسے انجن تیار کیے گئے ہیں جو صرف بائیو گیس پر ہی چلائے جاسکتے ہیں وہیں کچھ دوہرے ایندھن سے (20 فیصد ڈیزل اور 80 فیصد بائیو گیس) چلتے ہیں اور جاڑوں کے موسم میں بہتر طور پر گیس تیار کرنے کے لیے شمسی حراری نظامات کو بائیو گیس پلانٹ کے ساتھ نہایت کامیابی سے جوڑا گیا ہے۔ بائیو گیس ڈائجسٹر کے چار قسم کے ڈیزائن تیار کیے گئے ہیں: تیرنے والا گیس ہولڈر ڈائجسٹر، فکسڈ ڈوم، ڈائجسٹر اور تجرباتی چھوٹے اور سستے ڈائجسٹر۔ آج کل چاروں طرح کے ڈائجسٹر وں کا رواج چل رہا ہے۔ شروع شروع میں ہمارے ملک میں ڈائجسٹر وں کا جو ڈیزائن سب سے زیادہ مقبول ہوا وہ تیرنے والے گیس ہولڈر ڈائجسٹر کا تھا۔ زنگ لگنے، گیس رسنے اور دھاتی گیس ہولڈر کی تعمیر پر آنے والی لاگت کچھ ایسے مسائل تھے جن کی وجہ سے ان کی مقبولیت ایک دم ہی ختم ہوتی چلی گئی۔ توقع ہے کہ اگر گیس ہولڈر کسی سستے اور زنگ سے مبرا اور پائیدار سامان سے تیار کیا جائے تو اس سے اس ڈیزائن کو از سر نو مقبولیت حاصل ہونے میں مدد ملے گی۔ اسی امکان کے باعث آنے والے زمانے میں سستے اور عمدہ کوالٹی کے تیرنے والے گیس ہولڈر فائبر گلاس سے بھی تیار کیے جاسکتے ہیں۔

آج ہندوستان میں فکسڈ ڈوم ڈائجسٹر کو سب سے زیادہ مقبول ڈیزائن قرار دیا جاسکتا ہے، اس کی مقبولیت کی وجوہات یہ ہیں کہ اس کی تعمیر پر لاگت کم آتی ہے، تعمیر میں کام آنے والا سامان علاقائی طور پر دستیاب ہو جاتا ہے، اس کا ڈھانچہ زمین کے اندر چھپا رہتا ہے اور اس میں دھات کا بنا ہوا تیرنے والا مہنگا گیس ہولڈر بھی نہیں ہوتا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ہی اس کے رکھ رکھاؤ پر خرچ کم آتا ہے۔ دوسری جانب چنائی اور پلاسٹر کے ذریعے تیار کیے جانے والے گنبد میں چند برسوں میں ہی دراڑیں بھی پڑ جاتی ہیں جن کی وجہ سے گیس رسنے لگتی ہے اور اس کی مرمت ایک دشوار کام ہے۔ اس لیے اس فکسڈ ڈوم ڈائجسٹر کو زیادہ کارگر بنانے کے لیے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ کسی ایسی سستی چیز کو ڈھونڈنے کے کام میں زیادہ سرگرمی دکھائی جائے کہ جس سے گنبد کے اندرونی حصے پر مناسب انداز میں پلاسٹر کر کے اسے سیل بند بنایا جاسکے۔

ہمارے ملک میں پلاسٹک بیگ ڈائجسٹر سے جو تجربات کیے گئے اس کے بہت کم اعداد و شمار ہی حاصل ہو پائے ہیں۔ تاہم فلیکو بل بیگ ڈائجسٹر وں کے استعمال سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ کام کاج سے متعلقہ، چند مسائل، تنصیب کرنے میں آسانی او رکم خرچ، زیادہ پائیداری اور گیس کا مستحکم دباؤ اس کے نمایاں فائدے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ نسبتاً غریب طبقے کے لوگوں کے لیے چھوٹے اور سستے ڈائجسٹر زیادہ مناسب رہتے ہیں، مزید یہ کہ ان چھوٹے ڈائجسٹر وں میں چارے کی ضرورت بھی کم پڑتی ہے اور دیہاتوں میں گوبر کی کمی کے مدِنظر یہ بات نہایت مناسب ہے۔ مروجہ ڈائجسٹر وں کے غیر متحرک کردار پر قابو پانے کے لیے پورٹیبل ڈائجسٹر بھی تیاری کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔

نیشنل اوپن وائرنمینٹل انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کیے جانے والے تجربات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اگر رو کے رکھنے کی مدت 30 دن ہو اور طیران پذیر (volatile) ٹھوس مادوں کی روزانہ نامیاتی لوڈنگ 1.6 کلوگرام فی مکعب میٹر ہو اور گوبر اور جل کھمبی کو 1:3 اور 1:1 کی نسبت میں ملایا جائے تو اکیلے گوبر کے مقابلے 3% گیس پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک افقی پلانٹ ہوتا ہے۔ اس میں لوہے کا بنا ہوا تیرتا ہوا ایک گنبد ہوتا ہے اس کے ایک سرے پر عمودی طور پر نصب ایک فیڈ پائپ (خوراک ڈالنے کا پائپ) ہوتا ہے۔ اس پائپ کے ذریعے اس میں نباتی مادہ بطور چارا ڈالا جاتا ہے۔ چارے کو بانس سے اس پائپ کے ذریعے اندر دھکیلتے ہیں۔ اس کا فرش اور چھت دونوں ترچھے ہوتے ہیں جس سے ہلکے وزن والے نباتی مادہ اور کیچڑ کو باہری راستے کی طرف جانے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مناسب سائز کی ایک بڑی بیرونی موری بھی ہوتی ہے جس کے ذریعے کیچڑ کو باہر نکال کر ٹھکانے لگایا جاسکتا ہے۔

ریجنل ریسرچ لیباریٹری، جورہاٹ، آج کل معیاری سامان تیار کرنے میں مشغول ہے تاکہ عملاً ایسے ابتدائی ڈائجسٹر تیار کیے جاسکیں جو زیادہ سے زیادہ کارآمد ڈیزائن والے ہوں۔ عملی مظاہرہ کرنے کے لیے 300 لیٹر گنجائش اور مختلف سائزوں اور مختلف چارا نظام والے دو پلانٹ کئی ماہ تک CMERI کالونی کے سینٹرل اسکول کے عمارت اور درگاپور میں واقع انسٹی ٹیوٹ کیمپس میں چلائے جاتے رہے۔ بائیو گیس پلانٹوں (3 تا 8 مکعب میٹر کس روزانہ) کے ڈائجسٹر وں کو تعمیر کرنے کے لیے فیرو سیمنٹ کے پہلے سے ہی ڈھالی ہوئی قطعاتی اکائیوں کے نظام کو بروئے کار لاکر ان کی جانچ روڑکی میں واقع اسٹرکچرل انجینئرنگ ریسرچ سینٹر پر کی گئی یہ ڈائجسٹر 15 تا 18 ملی میٹر موٹے اور پہلے سے ہی ڈھال کر رکھے گئے 6،4 اور 8 قطعات سے تعمیر کیے جاتے ہیں۔ جب ان قطعات کو عمودی طور پر رکھ کر جوڑتے ہیں تو ان کے سروں پر

سے باہر نکلا ہوا تار کا جال ایک دوسرے کو آپس میں جوڑنے میں کام آتا ہے جوڑوں پر سے نکلنے والے تار کے سرے ڈائجیسٹر کی دیوار میں اندر جانے اور باہر آنے والے پائپوں کو جگہ فراہم کراتے ہیں، پھر سیمنٹ اور ریت کا مرتکز آمیزہ استعمال کر کے جال کے جوڑوں پر پلاسٹر کر دیتے ہیں اس طرح اس پر پسلیوں کی سی شکل بن جاتی ہے جنھیں ربس (ribs) کہتے ہیں۔ چھت، درمیانی حصہ اور نچلے حصوں سے باہر نکلنے والے پائپوں، جوڑوں اور افقی جوڑوں پر سیمنٹ کا پلاسٹر کر کے انھیں مزید مضبوط بنا دینا چاہیے۔ ہمارے ملک میں روزانہ 2.6 میٹر اسٹیل گنجائش گیس پیداوار کے کام میں آنے والے فیروسیمنٹ (سیمنٹ اور اسٹیل کے جال سے تیار شدہ) کے گیس ہولڈر بھی ڈیزائن کیے جا چکے ہیں۔ یہ گیس ہولڈر اسٹیل کے گیس ہولڈروں کے مقابلے 40 تا 50 فیصد سستے ہوتے ہیں۔

نیشنل اوپن وائرنمینٹل انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (NEERI)، ناگپور نے نائٹ سائل ڈائجیسٹر کی ڈیزائن کاری کی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بغیر سوچے سمجھے اس کا ڈھیر ادھر ادھر نہ لگا کر یا کھیت میں غیر صحت مندانہ انداز میں جمع نہ کر کے اس کا استعمال قاعدے سے کیا جائے۔ یہ ڈائجیسٹر نامیاتی مادہ کی تکسید کرتا اور ناگوار بو سے نجات دلا دیتا ہے۔ اس میں سے بیماری پھیلانے والے جراثیم کو ختم کر دیتا ہے اور بچی ہوئی کیچڑ کی شکل میں دیسی کھاد فراہم کرا دیتا اور میتھین گیس کو گھریلو استعمال کے لیے دستیاب کرا دیتا ہے۔ اس تکنیک کو چھ مقامات پر بروئے کار لایا گیا ہے۔ رام کرشنا مشن، کوئمبٹور، ایگریکلچر کالج، راہوڑی، مہاراشٹر، سُلبھ انٹرنیشنل پٹنہ، ناگپور کے قریب برج واڑ گاؤں گارڈین ریچ، میونسپلٹی، کلکتہ اور دہلی کنٹونمنٹ بورڈ، دہلی۔ پٹنہ میں جو پلانٹ نصب ہے اس میں صرف نائٹ سائل ہی استعمال کی جاتی ہے جبکہ دیگر پلانٹوں میں نائٹ سائل اور مویشیوں کے گوبر کا آمیزہ استعمال کیا جاتا ہے۔

تاکل کے عمل (corrosion process) کو الٹنے کے لیے سینٹرل سالٹ اینڈ میرین کیمیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھاؤ نگر نے تاکل سے بچانے کے لیے ایک برق کیمیاوی طریقہ دریافت کیا ہے۔ یہ طریقہ سستا بھی ہے اور دیہاتوں میں کسان اسے آسانی سے اختیار کر سکتے ہیں، اس میں نگرانی کرنے کی ضرورت ہے اور نہ رکھ رکھاؤ پر ہی کچھ خرچ ہوتا ہے۔ گوبر اور مویشیوں کے فضلوں سے بائیوگیس تیار کرنے کی تکنیک سے ہندوستان میں لوگ کئی دہائیوں سے واقف ہیں۔ بائیوگیس کے بہت سے فوائد ہیں مثلاً اس کے استعمال سے دھواں نہیں ہو پاتا، صفائی ستھرائی زیادہ رہتی ہے، گھروں کا ماحول صاف رہتا ہے نیز یہ کہ فضلوں کی تحلیل کے بعد دیہاتوں میں دیسی کھاد کی پیداوار برقرار رہتی ہے DNES کے ذریعے نافذ کردہ بائیوگیس فروغ دینے والے قومی پروجیکٹ کے تحت دسمبر 1986 تک 0.65 ملین سے بھی زیادہ پلانٹ نصب کیے جا چکے تھے۔ اس سے 2.5 ملین ٹن سے بھی زیادہ لکڑی کی بچت ہوگی جس کی قیمت 1000 ملین روپے سالانہ ہوتی ہے۔ اس کی باقی ماندہ تلچھٹ سے ایک بہترین فرٹی لائزر اور حاصل ہوتا ہے جس سے تقریباً 1000 ملین روپے سالانہ کی اور بچت ہوتی ہے۔

ایسے چولہے بھی تیار کیے جا رہے ہیں، جن سے دھواں نہیں نکلتا اور ان میں بے کار لکڑی جلائی جاتی ہے۔ یہ چولہے دیہاتوں میں مروجہ روایتی چولہوں کی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔ دراصل یہ چولہے ہندوستانی دیہاتوں میں "دھوئیں سے مبرّا انقلاب" بن گئے ہیں، تقریباً ایک ملین چولہے اب تک فراہم کرائے جا چکے ہیں اور 6000 دیہاتوں کو دھوئیں سے پاک کر دیا گیا ہے۔

ہندوستان میں بروئے کار لائی جانے والی تقریباً 40 فیصد توانائی کا استعمال کھانا پکانے میں کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے 112 ملین گھروں میں اینٹ گارے سے تیار کردہ چولہوں میں 133 ملین ٹن لکڑی اور 200 ملین ٹن سے بھی زیادہ گوبر کے اپلے پھونک دیے جاتے ہیں۔ مگر یہ چولہے اس قدر ناکارہ ہوتے ہیں کہ ہندوستان میں دیہاتوں میں عورتوں کو جلانے کی لکڑی اکٹھی کرنے اور باورچی خانوں میں کام کرنے میں بہت زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے جبکہ یہ باورچی خانے دھوئیں سے بھرے رہتے ہیں اور ہندوستانی سائنسدانوں کے بقول بے جلے ایندھن کے یہ ذرات (دھواں) کینسر کا سبب ہوتے ہیں۔ ان بہتر قسم کے چولہوں کی کارکردگی 15 فیصد سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور انھیں چولہوں کے سبب ایندھن لکڑی کی کھپت میں زبردست کمی آئی ہے اور کیونکہ ان چولہوں کو دھوئیں سے مبرّا ڈیزائن پر تیار کیا گیا ہے اسی لیے ان کے استعمال سے باورچی خانے بھی دھوئیں سے پاک رہنے لگے ہیں۔ اصلاح شدہ چولہوں کے تقریباً 51 ماڈل تیار کیے جا چکے ہیں اور مختلف سماجی تنظیمیں اور تحقیقی ادارے۔ جیسے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (IIT)، دہلی، دی سینٹرل پاور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس (IIS)، بنگلور اس قسم کے چولہے بنا کر پیش کر چکے ہیں۔ مختلف علاقوں میں حاصل ہونے والی لکڑی اور کھانوں کے مطابق ہی یہ چولہے بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں، ان ڈیزائنوں میں جن چیزوں کا لحاظ کر کے انھیں شامل کیا گیا ہے وہ ہیں: ایندھن جلائے جانے والے حصہ کا مناسب ترین سائز، ہوا اندر داخل ہونے کا بہتر راستہ، چولہے کی تلہٹی میں (جہاں ایندھن جلتا ہے) ہوا کے دخول کے لیے سوراخ، ہوا کے بہاؤ کو کنٹرول کرنے کے لیے ہوا روک (کھڑکی)، حرارت کی منتقلی کے لیے رکاوٹیں، کچھ چمنی یا بغیر چمنی والے ماڈل باورچی خانوں میں مستقل طور پر نصب کرنے کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ دیگر ماڈل Portable

ہیں یعنی انھیں ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھا جا سکتا ہے اور انھیں دھاتی چادروں یا دیگ چون سے یا پھر دونوں کے امتزاج سے تیار کیا گیا ہے۔ ایندھنی لکڑی کے علاوہ زیادہ تر ماڈل ایسے ہیں کہ جن میں اپلے، کوئلے یا ٹکڑے کیا ہوا زراعتی فضلہ استعمال کیا جاتا ہے، تین پلڑوں والے" اسٹرا اولے" کی IIS نے ڈیزائن کاری کی ہے اور اس میں 60 گرام ایندھن سے ایک کلوگرام چاول پکائے جاسکتے ہیں جب کہ اس کے برعکس روایتی چولہے میں اسی کام کے لیے 400 گرام ایندھن خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ان تمام ڈیزائنوں کی جانچ پڑتال کر کے ان کی توثیق ان جانچ پڑتال اور ٹریننگ مراکز پر کی جاتی ہے۔ جنھیں اس کام کے لیے خصوصی طور پر IIT، CRPI اور پنجاب یونیورسٹی آف ایگریکلچر، چنڈی گڑھ میں قائم کیا گیا ہے۔

ہندوستان کی تمام 25 ریاستوں اور مرکز کے اہتمام کے تحت آنے والے علاقوں میں یہ انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ ریگستانی ریاست راجستھان کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں 135,000 اصلاح شدہ چولہے اور 365 دھوئیں سے پاک دیہات موجود ہیں۔ اس کے بعد نمبر آتا ہے شمالی ریاست ہریانہ کا جہاں صرف ایک برس میں اس قسم کے 84000 چولہے نصب کر کے 200 دیہاتوں کی مستورات کو دھوئیں سے نجات دلا دیا گیا ہے۔ DNES کے فنڈ اور امداد فراہم کرانے کی وجہ سے رضاکارانہ تنظیموں، ریاستی نوڈل ایجنسیوں اور آل انڈیا ویمنس کانفرنس جیسی عورتوں کی کئی تنظیموں نے اس پروجیکٹ کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ DNES نے لوگوں کو اس قسم کے چولہے تیار کرنے کی ٹریننگ دینے کے لیے 1,547 ٹریننگ پروگرام چلائے ہیں، اس طرح سے ٹریننگ حاصل کر کے استاد بن جانے والے یہ لوگ اپنے گاؤں کے مرد عورتوں کو ٹرینڈ کر دیتے ہیں۔ 1986 میں قریب 81,000 لوگوں نے یہ ٹریننگ حاصل کی تھی اور DNES کو امید ہے کہ 1987 کے آخر تک قوت کار 100,000 افراد تک یہ مشتمل ہو جائے گی۔ ہر مستری ایک دن میں پانچ چولہے تیار کر لیتا ہے اور اجرت میں 25 روپے کما لیتا ہے۔

ایک جگہ نصب کیے جانے والے چولہے تو سرکاری ایجنسیاں اور رضاکارانہ تنظیمیں ہی نصب کراتی ہیں مگر اٹھاؤ چولہے 12 عدد پرائیویٹ کمپنیاں کھلے بازار میں 38 تا 63 روپے میں فروخت کرتی ہیں۔ یہ کمپنیاں اس دھوئیں سے پاک انقلاب کا فائدہ اٹھانے کے لیے اچانک پیدا ہوگئی ہیں۔ لوگوں میں ایسے ایندھن اثر آفریں چولہوں کے استعمال کرنے کا شوق پیدا کرنے کے لیے جن میں لکڑی جلائی جاتی ہے حکومت نے ایکسائز ڈیوٹی ختم کر دی ہے۔

DNES نے 200 افراد تک کی جماعت کے لیے ایسے کیمونٹی چولہے بھی تیار کیے ہیں کہ جن کی کارکردگی 35 فیصد تک ہے۔ ان چولہوں کو ہوٹلوں، ہوٹلوں اور کینٹینوں میں لگانے کی سفارش کی جاتی ہے۔ تامل ناڈو حکومت اسکولی بچوں کو دوپہر کا ناشتہ فراہم کرانے کا پروگرام چلا رہی ہے۔ اب یہ ان اصلاح شدہ کیمونٹی چولہوں کو اپنے یہاں 33,000 اسکولوں میں نصب کرانے کا پروگرام بنا رہی ہے کیونکہ ایندھن کی کمی کے سبب اس دوپہر کے ناشتے کے پروگرام کو خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔ یہ نئے چولہے ایندھنی لکڑی کے وسائل کو وسیع تر کرنے اور دیہاتی عورتوں کو غلامی سے نجات دلانے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔

بائیو ماس ریسرچ سینٹر گڑھوال یونیورسٹی، سری نگر بائیو ماس میں اضافہ کرنے کے لیے پہاڑی انواع کے پیڑ پودوں کی تلاش میں مشغول ہے۔ اس سلسلے میں بیجوں کے اگنے، نموطرز عمل آسانی سے فصل تیار کرنے کا امکان، ضیائی تالیف اور (حاصل ہونے والی) لکڑی کی خصوصیات کے مطالعے کیے جا رہے ہیں۔ منطقہ حارہ اور درجۂ حرارتی حالات میں مناسب ترین درجۂ حرارت کے تحت اب تک تقریباً 70 انواع کو تلاش کر کے اکھٹا کیا جا چکا ہے۔

زیادہ تر پھل دار انواع میں اگنے کی فیصد صلاحیت زیادہ ریکارڈ کی گئی ہے۔ تاہم چارہ اور ایندھن اور ایندھن کی ایک امید افزا نوع البز یا لیبک کے تازہ بیجوں میں خوابیدگی کے آثار نظر آتے ہیں اور انھیں جلدی اور یکساں طور پر اگانے کے لیے گرم پانی دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ٹونا سلیاٹا، سیڈریلا البنس انڈیکا، ہولوپلیپا انٹیگری فولیا، البنس نیپالینس اور مارٹنگ ایٹی فیرا نے رفتہ رفتہ اپنی نشو و نما پانے کی صلاحیت گنوا دی ہے۔ نموطرز عمل کا مشاہدہ کرنے سے پتہ چلا ہے کہ پرونس سیرے سونڈس، اے لیبک ٹرمی نیلیا بیلے رکارڈ لبرجیا سسو سپینڈس مسکوروسی، اولیا گلینڈولی فیرا اور ٹوناسلی آٹا کچھ ایسی انواع ہیں جن سے پہاڑی علاقوں میں بڑی مقدار میں بائیو ماس کے لیے چارہ اور ایندھن حاصل ہونے کی توقعات وابستہ ہیں۔ ایک ایسی حسابی مساوات معلوم ہوئی ہے جو پتیوں کی مناظری خصوصیات پر مبنی ہے اور جس کے ذریعے ایک خاص موسم کے تحت کسی نوع کے بائیو ماس پیداواری امکان کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔ اس مرکز نے پود تیار کرنے کی اسٹائر وفوم کی 30 سم لمبی اور چوڑی اور 10 سم اونچی ایک ٹرے کی ڈیزائن کاری کی ہے۔ اس میں سولہ پودے رکھنے کی گنجائش ہے جب کہ اس کا وزن کل 5 کلوگرام ہی ہے اور یہ پورے 6 ماہ کے پوری طرح تیار پودے ہیں۔ یہ ٹرے پود تیار کرنے اور ان کی نقل و حمل میں استعمال کی جاسکتی ہے، اس کے استعمال سے فی پودا مجموعی لاگت میں کمی آجاتی ہے اور پودا زمین میں لگانے سے پہلے کیونکہ اس کی جڑوں میں کسی قسم کی خلل اندازی نہیں ہو پاتی اس لیے اس کے زندہ رہنے کے امکانات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

لکھنؤ میں واقع NBRI میں بائیو ماس ریسرچ سینٹر اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ نمکین اور قلوی زمینوں میں تیزی سے نمو پانے والے درختوں کی انواع کی

قابلِ تشخیص کی جاسکے۔ آزمائشی طور پر جب زیادہ کثیف انداز میں ٹری نیشیا ارجنا کے پودوں کو 0.500.66 پودے فی ہیکٹر کے مقابلے) یہ تین برس عمر والے پودے واضح طور پر زیادہ لمبے ہوگئے تھے۔ کثافت میں اضافے کے ساتھ ساتھ تنے کے قطر میں تو اضافہ ہوا مگر اختیار کردہ تدابیر واضح نہیں تھیں۔ بالحاظ کثافت پود، جڑوں کے پھیلنے والے زون کی 30 سم تک گہری مٹی کی pH اور قابل مبادلہ میگنیشیم میں کمی واقع ہوئی جبکہ نامیاتی کاربن، قابلِ مبادلہ سوڈیم پوٹاشیم اور کیلشیم کی مقدار میں اضافہ ہوا، البتہ برقی موصلیت میں واضح قسم کے تبدیلیاں نہیں ہو پائیں۔

جلانے والی لکڑی کی جھاڑی کی ایک نوع سیس بینیا اکیپلیا کا پر جو تجربات کیے گئے ان سے پتہ چلا کہ کل بائیوماس کی اصطلاحات میں یہ واضح طور پر ایک برتر نوع ہے۔ پودوں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ساتھ بائیوماس کی پیداوار میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بالحاظ انواع زمین کا pH کم اور نامیاتی کاربن کی مقدار میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جب سیس بینیا اکیپلیا کا کی کثافت 75000 پودے فی ہیکٹیر رکھی گئی تو Ca/Na کی نسبت میں نمایاں اضافہ دیکھنے میں آیا۔ پروسوپس جیولی فلور میں فی اکائی رقبہ بائیوماس کی پیداوار سب سے زیادہ دیکھنے کو ملی، پانچ ایسے کامیاب انواع میں جن کے باقی رہنے کی شرح 86 فیصد سے بھی زیادہ تھی سب سے زیادہ یکساں اوسط اونچائیاں ایکسیانلوٹیکا (Acacia nilotica) بھی دیکھنے کو ملیں۔

مدورائی کامراج یونیورسٹی مدورائی میں بائیوماس ریسرچ سینٹر اس لیے قائم کیا گیا کہ وہ تین میدانوں میں کھوج بین کرے، نیم خشک خطے میں اگانے کے لیے مناسب ایندھن لکڑی کی انواع کا انتخاب کرنا نرسری ٹیکنالوجی اور بڑے پیمانے پر پود کی تیاری اور مناسب رائزوبیائی انواع کا انتخاب کرنا۔ نوعدد منتخبہ انواع میں سے مدورائی ضلع میں خراب زمین کے نیم خشک حالات میں شجر کاری کرنے کے لیے ''لیوسینا'' کو سب سے مناسب نوع پایا گیا۔ یہ چیز بھی مشاہدے میں آئی کہ یہ سب سے زیادہ خشک سالی مزاحم ہے، ان منتخب چوبی بائیوماس انواع کی حیاتی پیداوار اور ضیائی تالیف اور بہت سے متعلقہ فعلیاتی پیرامیٹروں میں ربط پیدا کیا گیا۔ جن انواع میں کلوروفل کی مقدار زیادہ تھی ان میں ضیائی تالیف کی شرح کے ارتباط کی ڈگری زیادہ دیکھنے میں آئی۔ تنے کے محیط کی پیمائشوں کا استعمال کرکے درختوں کی مختلف خصوصیات کا تناسب اور لکڑی کی پیداوار کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کافی کھوج بین کے بعد ایک ایسے نئے تشکلی نمونے لیوسینا کو منتخب کیا گیا جو عام قسم سے چار گنا زیادہ پیداوار دیتا ہے۔ مرکز کی ذمے داری یہ ہے کہ وہ عملی کام کا مظاہرہ کرے اس لیے اس عملی کام کے ایک حصے کے طور پر منتخب جلانے والی لکڑی کے پودے اور پودوں کے بیج ضلع مدورائی کے کچھ تعلقوں میں تقسیم کیے گئے۔ یہ تقسیم کاری پاور پیدا کرنے رورل انرجی پلانٹیشن پروگرام کے تحت عمل میں آئی۔

آندھراپردیش کے انسٹی ٹیوٹ فار آف شور اینڈ کوسٹل ریسرچ آف وشاکھاپٹنم پر ایک بائیوماس ریسرچ پروجیکٹ فار کورومنڈل کوسٹ کفالت کی گئی۔ ایک فارم لینڈ لنکے لپالیم میں 45 ہیکٹیئر کے رقبے میں چار قسم کی مٹیاں ریتیلی لوم، لوم چکنی مٹی اور کنکریلی مٹی موجود تھی۔ پھلی دار پودوں کی سات اقسام البزیا لیبک کیسیا سیامی لیوسینا لیوکوسی فالا، سیتھے سیلوبیم ڈیولس، پروسوپس جیولی فلورا، سیس بینیا گرینڈی فلورا اور اکیسیا اور تین غیر پھلی دار اقسام سیاچین ٹینڈر کیسوارینا اکوی زیٹی فولیا اور یوکلپٹس ہائبرڈ اس فارم لینڈ پر بوئی گئیں، 9 انواع کے قابلِ تشخیص پر جو مطالعے کیے گئے ان کی رو سے سیس بینیا گرینڈی فلورا ایسی نوع ثابت ہوئی جس سے سب سے زیادہ توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں اور جس نے صرف 16 ماہ میں ہی 8 میٹر کی اونچائی اختیار کرلی۔ باقی تمام پودلوی زمین میں بہتر طور پر اگ پائے۔ ان تمام سطحوں پر زندہ یا باقی رہنے کی شرح 85% مشاہدے میں آئی۔

پیداوار اور پودوں کی نمو کا ربط ماحولیاتی تبدیلیوں سے پیدا کرنے کے لیے ریسرچ فارم پر انڈین مینورولوجیکل ڈپارٹمنٹ کی مدد سے ایک ڈاٹا کلیکشن پلیٹ فارم قائم کیا گیا یہ پلیٹ فارم ایسے آلات سے لیس ہے جو متواتر طور پر مختلف موسمی پیرامیٹروں کی پیائش کرتے رہتے ہیں۔ اعداد وشمار کی دوبارہ موصولی اور انھیں جمع کرنے کے کام پر جیوسنکرونس سیٹلائٹ INSAF-IB نگرانی رکھتا ہے۔

پروجیکٹ خلوی تولیدی اور کلچر کاری تکنیکوں کے ذریعے کی جانے والی اصلاح کے خصوصی حوالوں پر مبنی جلانے والی لکڑی فراہم کرانے والے پودوں کی تلاش'' کے تحت مندرجہ ذیل پہلوؤں پر مطالعے کیے گئے۔ تیزی سے نمو پانے والے ایندھن لکڑی فراہم کرانے والے منتخب پودوں کے کروموسوم حیثیت کی تحسیب کرنا مختلف طبیعی اور کیمیاوی تبدل ہائے کار کو استعمال کرکے تبدیل کے ترغیب امالہ اور کثیر گنیت کاری کے ذریعے نسلی اصلاح کرنا ان وٹروکلچر تکنیک کے ذریعے نسلی اصلاح کرنا ان وٹروکلچر تکنیک کے ذریعے منتخب پودوں کی تیزی سے کلونل افزائش کرنا تیزی سے تکثیر کرنے کے لیے اصلاح شدہ بیجوں کی تنمیت تکنیک کے امکان کا پتہ لگانا اور مختلف زرعی موسمی خطوں میں منتخب ایندھن لکڑی فراہم کرانے والے پودوں کی شرح نمو اور بائیوماس پیدا کرنے کی صلاحیت کا مطالعہ کرنا۔

چار انواع کی تفصیلی خلویات یاتی تجزیے سے یہ بات منکشف ہوئی ہے کہ لیوسینا لیوکوسیفالا ایک ایسی کثیر گونہ نوع ہے جس کا کروموسوم عدد

(2n=24) بہت زیادہ ہے۔ سیس بیبیا گرینڈی فلورا کا کروموسوم عدد سب سے کم (2n=24) ہے جب کہ اکیسیا آری کلی فارمس (A cacia auriculi formis) اور پروسوپس جیولی فلورا کے کروموسوم اعداد بالترتیب 2n=26 اور 52 ہیں بیجوں کے جمنے میں اور کثیر خلیہ مائی (cytoplasmic) شمولیتوں کے عمل کے وقت، دیگر انواع میں کیریوٹائپس کا حساب لگانے میں مشکلات اور تشویشناک بندشیں حائل ہوجاتی ہیں۔ سیس بیبیا گرینڈی فلورا کے معاملے میں مکمل باز پیدائش ان وٹرو حالت کی کامیابی سے تکمیل کرلی گئی ہے۔ جڑوں کے کامیابی سے پھیلنے کا امکان پیدا ہوجانے کے بعد لیوسینا لیوکوسیفالا میں تیز افزائش کرنے کے لیے پروفیوز شوٹ ملٹیپلی کیشن کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ لیوسینا لیوکوسیفالا، اکیسیا نلوٹیکا اور پروسوپس جیولی فلورا میں گاما اشعاع ریزی کے بعد یہ بات ریکارڈ کی گئی کہ زیادہ تر پودے کافی گھنے اور مضبوط ہوجاتے ہیں۔ اس سے اشعاع ریزی کے بعد دیگر مادوں میں بھی زیادہ بائیوماس پیداوار اور تیزی سے نمو کرنے کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح چند کیمیاوی تبدل کاروں کے استعمال کے بعد بھی یہی واقعہ دیکھنے میں آیا ہے۔ متبدلوں کی فیصلہ کن یا آخری چھان پھٹک سے کچھ ایسے تبدل کار ہاتھ لگ سکتے ہیں کہ جن کی بائیوماس پیداوار زیادہ ہو۔ سیس بیبیا گرینڈی فلورا کے معاملے میں کثیر گمیت کی ترغیب امالہ نہایت کامیابی سے انجام دی جاچکی ہے۔ بائیوماس پیداوار اور نموطرز عمل سے یہ واضح ہوگیا ہے کہ اکیسیا آری کلی فارمس سیس بیبیا گرینڈی فلورا، لیوسینا لیوکوسیفالہ اور ڈلبیر جیا سیسو میں امکانی قوت سب سے زیادہ ہوتی ہے چاہے انھیں کسی بھی خطے میں بویا جائے۔ چند مادوں کے بیجوں کو جلد اگانے کی تکنیک کو معیاری بنایا گیا ہے۔

توانائی سے مالا مال پھلی دار درختوں اور بہت سے دودھیلی پودوں کی تفتیش ہیلا نڈ بوٹانی سیکشن گورکھپور میں کی جارہی ہے۔ کیلوٹروپس جائیجانٹی یا اکانڈا خشک اور نیم خشک خطوں میں اگنے والا ایک سخت جان خودرو پودا ہوتا ہے۔ یہ پودا دودھیلا ہوتا ہے اور اس کا دودھ (M.W 10,000) ہائڈروکاربن کا ایک قوی وسیلہ ہوتا ہے۔ ان وٹرو کیلس کلچرس سے ننھے پودوں کی باز پیدائش اور خورد افزائش کے ایسے طریقے ڈھونڈ نکالے گئے ہیں جن کی مدد سے البیزیا، سیمانیا یا رین ٹری اور پیلٹوفورس یا کاپر پوڈ کے پودے تیار کیے جاسکتے ہیں۔ تجربات کے ذریعے یہ بات ثابت کی جاچکی ہے کہ بڑے پیمانے پر خورد افزائش کرنے کے لیے پودے کے تنے کے 0.5-10 ملی میٹر کے ٹکڑے سے صرف چھ ہفتوں کے اندر 30 سے 40 تک ننھے پودوں کی باز پیدائش کی جاسکتی ہے۔ ان ننھے پودوں کو زمین میں منتقل کرنے سے عام طور پر ہونے والی زیادہ شرح اموات پر اس طرح قابو پایا جاسکتا ہے کہ پہلے ان ننھے پودوں کو سایہ میں رکھ کر ان کی جڑوں کے جال اور ان کے تنوں کو وسیع و مضبوط کرلیا جائے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ تنوں کو مضبوط ہونے اور جڑوں کے پھیل جانے سے قبل ہی ننھے پودوں کو گملوں میں منتقل کردینے سے ان کی شرح اموات میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ جوجوبا (JoJoba) یعنی (Simmodsia chinensia link, schnd) چکنے تیل کا ایک اضافی وسیلہ ہے۔ اس کو ملک کے جنوبی نیم خشک اور مشرقی نیم نم علاقوں میں بونے کی کوشش کی گئی۔ اس نوع کی کارکردگی اچھی رہی اور پھلوں کے دوا دوار اور تیل بردار اجزا کی وجہ سے 50% تک پہنچ گئی۔ صاف اور واضح طور پر مغربی کنارے کے لیے چھتیس اقسام کے پودے اور مشرقی ساحل کے لیے 10 اقسام کے پودوں کا انتخاب کرلیا گیا۔ سرکاری محکموں، یونیورسٹیوں، ریسرچ اداروں اور پرائیویٹ اداروں کی مدد سے کثیر علاقائی آزمائشیں بھی کی جارہی ہیں۔ گجرات کے ایک پرائیویٹ باغیچے میں دو سال بعد پھول اور پھل آگئے۔ نباتی تیل یا تو ڈیزل کا بدل ثابت ہوسکتے ہیں یا پھر ڈیزل کی خصوصیات میں اضافے کا سبب بن سکتے ہیں۔ نباتی تیلوں کی کیلوریفک قدر اور احتراقی خصوصیت تقریباً ڈیزل آئل کے برابر ہی ہوتی ہیں۔ تاہم ان میں لزوجت اور کاربن تلچھٹ بہت زیادہ ہوتے ہیں اس سے انھیں انجن میں پمپ کرکے بخارات میں بدلنے میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر ان کی وجہ سے دھواں بھی بہت خارج ہوتا ہے۔ ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے دو طریقہ ہائے کار اختیار کیے گئے۔ اول تو ڈیزل انجن کو زیادہ ایڈیاباٹک بنایا گیا دوم یہ کہ نباتی تیل کا میتھائل یا ایتھائل الکوہل کے ساتھ ایسٹر بنایا گیا۔ یہ دونوں کوششیں IIT، مدراس میں کی گئیں، پہلے معاملے میں تو یہ کیا گیا کہ پسٹن سیلینڈر لائنر سیلنڈر ہیڈ کو ترابیات کی پرت ہوائی خلا کے ذریعے عاجز بنا کر انجن تیار کیا گیا۔ انجن میں حراری زیاں کی زبردست کمی واقع ہونے کے سبب جب دباؤ ڈالا جاتا ہے تو عام انجن کے بہ نسبت اس انجن میں درجۂ حرارت کافی زیادہ ہوجاتا ہے۔ اس طرح اس انجن میں نباتی تیل کی تبخیر اور احتراق دونوں میں ہی آسانی واقع ہوگئی۔ دوسری کوشش یا معاملے کے تحت عمل انگیز کی موجودگی میں نباتی تیل کا تعامل ایتھائل یا میتھائل الکوہل سے کرایا جاتا ہے تاکہ اس تیل کا ایسٹر اور گلیسرین حاصل کیے جاسکیں۔ اس طریقے کو اختیار کرکے نباتی تیل کی لزوجت کم کرکے ڈیزل کی سطح پر لائی جاتی ہے اور اس کی کاربن کی تلچھٹ میں بھی تخفیف ہوجاتی ہے۔ کرنجی، سال سیڈ، چاول کی بھوسی کے تیلوں پر IIT، مدراس میں تفتیش چل رہی ہے۔ ایک انجن کو ایڈیابیٹک بنا کر اس کو کرنجی کے تیل سے چلانے کی آزمائش کی جاچکی ہے۔ احتراق کے سبب دباؤ کے اضافے کی شرح دیر میں بڑھ پاتی ہے اور اس طرح عام انجن کے مقابلے یہ انتہائی دباؤ زیادہ ہوتے ہیں۔ اس طرح

حرارت کو ضائع نہ ہونے دینے کے فوائد واضح ہو جاتے ہیں۔

دیہی سطح پر لکڑی اور زرعی باقیات پر مبنی گیس تیار کرنے کے تین پروجیکٹ چلائے جا رہے ہیں، ان کا مقصد آب پاشی سے منسلک ہے اور یہ پروجیکٹ IIT، دہلی، اور جیوتی سولر انرجی انسٹی ٹیوٹ، گجرات میں چلائے جا رہے ہیں۔

IIT، دہلی کے کیمیکل انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ میں ایک گیسی فائر۔کم۔کلین اپ نظام فروغ دیا گیا ہے۔ گیس تیار کرنے والی اکائی یا گیسی فائر یونٹ اتنی سادہ ہوتی ہے کہ ایک اناڑی اور معمولی سا کھیت مزدور بھی اسے آسانی سے چلا سکتا اور دیکھ ریکھ کر سکتا ہے۔ گیسی فائر میں تیار ہونے والی پروڈیوسر گیس کو کارگر انداز میں صاف اور ٹھنڈا رکھنے کے لیے وینیڈ وال سائکلون کی ڈیزائن کاری کی گئی ہے۔ ایک سادہ سا بیج چارنگ کن کی ڈیزائن کاری بھی کی گئی ہے اور مختلف قسم کے بائیو ماس کو جلا کر کوئلہ بنانے کے لیے مندرجہ بالا دونوں چیزیں تیار کرلی گئی ہیں۔ یہ اکائیاں کامیابی سے کام انجام دے رہی ہیں۔ گیسی فائر نظام سے 820 Kcal/m3 گیس پیدا کر کے 200 گھنٹوں تک بغیر کسی پریشانی کے کام کیا جا سکتا ہے۔ میکینکل انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ، IIT، دہلی کی ٹیم نے جو 5 HP کا C.I. انجن پمپ نظام فراہم کرایا اس نے نہایت کامیابی سے اپنا کام انجام دیا اور تقریباً 70% ڈیزل کی بچت ہوگئی احتراقی انجنوں میں کارگر انداز سے پروڈیوسر گیس استعمال کرنے کے سلسلے میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، دہلی کے میکینیکل انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ میں کھوج بین اور کام کیا جا رہا ہے۔ موجودہ 5-3 ہارس پاور کے پیٹرول اور ڈیزل انجنوں میں اصلاح کر کے انھیں پروڈیوسر گیس سے چلنے والے بنا لیے گئے ہیں۔ 20-5 ہارس پاور کے اسٹیشنری اور آٹوموٹو قسم کے پیٹرول انجنوں میں اصلاح کر کے انھیں، صد فیصد پروڈیوسر گیس سے، چلنے والا بنا لینے کے بعد ان کی زبردست کارکردگی اور ران کے اخراج کے سلسلے میں جانچ پڑتال چل رہی ہے۔ آب پاشی کے کام کے لیے بہت زیادہ استعمال میں آنے والے 5 ہارس پاور والے ڈیزل کے انجن میں اصلاح کر کے اسے مکمل لوڈ کے 80 فیصد حصے کے لیے پروڈیوسر گیس سے توانائی فراہم کرائی گئی۔ انجن کے ڈیزائن اور عمل آرا پیرامیٹروں۔ جیسے انجکشن ٹائمنگ کمپریشن ریشو، ان ٹیک سسٹم وغیرہ۔ تجربات کے ذریعے مناسب ترین بنا لیا گیا ہے تاکہ پروڈیوسر گیس کا احتراق اثر آفریں انداز میں ہو سکے۔ اس طرح اگر انجن پمپ 6-5/ کلوواٹ کا جنریٹر (gen set) 10 گھنٹہ روزانہ کے حساب سے چلایا جائے تو ڈیزل پر آنے والے خرچے میں 5000 روپے سالانہ سے بھی زیادہ کی بچت ہو جائے گی۔

گیسی فائر پروگرام کے تحت جیوتی سولر انرجی انسٹی ٹیوٹ دلبھ ودیا نگر، نے گیسی فائر کا ایک ایسا نظام فروغ دیا ہے کہ جس سے آب پاشی کرنے کے لیے 3.7 kw کا انجن پمپ چلایا جا سکتا ہے اور انسٹی ٹیوٹ سے 7 کلومیٹر پر واقع جو ہر گاؤں میں'' کسان کے کھیت میں طرز پر عملی مظاہرہ کا ایک یونٹ نصب کیا ہے۔ یہ ڈاؤن ڈرافٹ گیسی فائر ہے جس میں ہوا کو پہلے ہی گرم کرنے کی سہولت موجود ہے۔ یہ نظام بغیر کوئی تکنیکی مسئلہ کھڑا کیے تقریباً 500 گھنٹوں تک کام انجام دے چکا ہے۔ اس میں 3.4 kg/h کی شرح سے لکڑی کی کھپت ہوتی ہے اور اس طرح 60 فیصد ڈیزل کی بچت ہو جاتی ہے اس اکائی کے کام کرنے کا خرچ شافٹ پاور کے ایک kwh کے لیے 70 پیسے بیٹھتا ہے جب کہ اسی کام کے لیے بجلی کا خرچ 0.87 روپے اور ڈیزل کا خرچ 1.07 روپے بیٹھتا ہے۔

تامل ناڈو میں تروچراپلی پر نصب ایک چھوٹے پیمانے کے میگنیٹو ہائیڈروڈائنامکس پاور جنریٹر سے جو اعداد و شمار حاصل ہو رہے ہیں ان کی بنا پر بڑے اور ایسے MHD پلانٹوں کی ڈیزائن کاری کی جا سکتی ہے جو نسبتاً سستی بجلی پیدا کرنے کے اہل ہوں گے اور جن کی کارکردگی کوئلہ سے چلنے والے موجودہ پاور پلانٹوں یا نیوکلیر پاور پلانٹوں سے کہیں زیادہ ہوگی۔ پاور پیدا کرنے کا کام بھابھا اٹامک ریسرچ سینٹر ممبئی کے اشتراک سے بھارت ہیوی الیکٹریکلس لمیٹڈ میں انجام دیا گیا۔ MHD پاور جنریشن کا اصول یہ ہے کہ اس حراری توانائی کو بلاواسطہ طور پر برقی توانائی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اور اس طریقۂ کار پر کئی ممالک میں تجربات چل رہے ہیں جیسے روس، متحدہ ریاستہائے امریکہ، جاپان، چین، نیدرلینڈس، آسٹریلیا، پولینڈ اور فن لینڈ۔

BHEL کے ایک سینئر سائنسداں کے مطابق MHD کے ذریعے حراری توانائی کو برقی توانائی میں منتقل کرنے کے لیے ہوتا یہ ہے کہ طاقتور مقناطیسی میدان میں مخالفت کرنے والی قوت کے برخلاف برقی طور پر موصل پذیر، پر گرم گیس (یعنی جس کا درجۂ حرارت 2, 800k کے قریب ہوتا ہے) پھیلنا شروع کر دیتی ہے جس کے نتیجے میں بلاواسطہ طور پر برقی پاور پیدا ہوتی ہے۔ MHD میں ٹربائن اور جنریٹر، عملاً، ایک واحد اکائی میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں مگر اس میں متحرک حصے موجود نہیں ہوتے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پہلے سے ہی گرم کی گئی ہوا (1, 200oC اور 5 atm) سے اگر ایندھنی تیل، کوئلہ، قدرتی گیس یا پاور گیس کا تعامل کرایا جائے تو پیدا ہونے والے شعلہ کا درجۂ حرارت 2, 500oC ہوتا ہے۔ اس درجۂ حرارت پر حراری آئیونائزیشن تو واقع ہو جاتا ہے مگر الیکٹران کثافت اس قدر کم ہوتی ہے کہ احتراقی مرکبات میں منافع بخش برقی موصلیتیں (electric conductivities) پیدا نہیں ہو پاتیں۔ تاہم آسانی سے آئیونائز ہو جانے والے اور 1% ارتکاز والے دھاتی بیج جیسے سیزیم یا پوٹاشیم کو اگر احتراق کے عمل

کے دوران، ملا دیا جائے تو 10-100 mho/m3 کی رینج میں مطلوبہ موصلیت مہیا ہوجاتی ہے۔ جس آلے میں یہ مشکل کام انجام دیے جاتے ہیں اسے MHD احتراق گر یا کمبسٹر کہتے ہیں۔ کمبسٹر میں ایک نوزل لگا ہوا ہوتا ہے جو پلازما میں اسراع پیدا کردیتا ہے جس کی وجہ سے پلازما کی رفتار ذیلی صوتی یا بالاصوتی ہوجاتی ہے۔ MHD جنریٹر میں اسراع براری اور برقی توانائی نکال باہر کردینے یا نچوڑنے کا عمل واقع ہوتا ہے۔ MHD جنریٹر 4-5 tesla کے اعلیٰ مقناطیسی میدان میں واقع ہوتا ہے۔ کولڈ ایگزہاسٹ، اسٹل اونچے درجۂ حرارت پر واقع ہوتی ہے۔ یہ اسٹل ان پٹ توانائی کے باقی ماندہ (ایک بہت بڑے) حصے کو اپنے ہمراہ لے جاتی ہے جو بھاؤ کے نیچے کی طرف واقع رینکن پلانٹ میں مزید پاور پیدا کرنے میں کام میں لائی جاتی ہے۔ اسٹریم جنریٹر سے گزرنے کے بعد ایگزہاسٹ سے دھلائی کے ذریعے قیمتی بیج علیحدہ کرلیا جاتا ہے اور اسے اسٹاک کے ذریعے باہر دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس بیج کو اکٹھا کرلیا جاتا ہے اور پراسیسنگ کے ذریعے اس میں سے تمام ملاوٹیں دور کردی جاتی ہیں اور اس دور کو ازسرنو دہرا دیا جاتا ہے۔ بعد میں DC برقی آؤٹ پٹ کو کمبسٹر کے ذریعے AC اور حراری زیاں میں بدل دیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں کوئلہ پر مبنی MHD ریسرچ پروجیکٹ کی کفالت ''ڈپارٹمنٹ آف نون کنوینشنل انرجی سورسیز کرتا ہے۔ کوئلہ پر مبنی MHD پروجیکٹ کا مقصد یہ ہے کہ MHD پاور جنریشن کے میدان میں 5MW سطح والا ایک تھرمل پاور اسٹیشن قائم ہوجائے اور اس طرح تحقیق و فروغ کے لیے مناسب بنیاد پڑ جائے۔ BARC نے اس سہولت کے زیادہ تر اہم آلات تیار کیے ہیں جن میں 300 ٹن کا ایک برقناطیس خصوصی پلازما تشخیص آلات، اعلیٰ درجۂ حرارتی تربیات سامان اور کنٹرول اور تجرباتی پلانٹ کے لیے آلات کاری نظام کا نام لیا جاسکتا ہے۔ مارچ 1985 میں پلازما تیار کرنے کے لیے جو تجربات کیے گئے ان کی بنا پر 2,700k اور بہت زیادہ برقی موصلیت پر MHD گریڈ کا پلازمہ تیار ہوگیا۔ پلازما تیار کرنے کی دوڑ میں پہلی کامیابی اس وقت ملی جب اس سے پاور تیار کرنے کے ایک پروجیکٹ کی اگست 1986 میں تکمیل ہوگئی۔ پاور کی تیاری میں 60% مقوی آکسیجن کا استعمال کولڈ آکسی ڈائزر میں کیا گیا۔ اب تک جتنے بھی تجربات کیے گئے ہیں ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ نئی ٹیکنالوجی سے توانائی میں منتقلی کی اہلیت میں اضافہ ہوسکتا ہے اور ہندوستان کی موجودہ 20-30 فیصد اہلیت بڑھ کر 46% تک ہوسکتی ہے۔ ٹیکنالوجی میں مزید ترقی کرلینے کے سے استعداد اور بھی زیادہ دیدہ زیب ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ 70% گنجائش استفادہ پر تنصیب شدہ گنجائش کی فی 100MW کے لیے سالانہ 8,00,000 ٹن کوئلہ کی بچت کی جاسکتی ہے۔

MHD بھاپ پلانٹ سے جس مقدار میں حرارت خارج ہوتی ہے وہ سب سے بہتر اور مروجہ پلانٹ کے مقابلے 50% کم اور نیوکلیائی پاور کے مقابلے 25% کم ہوتی ہے اس لیے MHD بھاپ پلانٹ ایسی جگہ نصب کیے جاسکتے ہیں جہاں ایندھن تو فراوانی سے دستیاب ہو مگر اسے ٹھنڈا کرنے والے پانی کی کمی ہو۔ MHD پروجیکٹ سے دو برس والے تجرباتی پروگرام کی شروعات ہوتی ہے۔ امید ہے کہ ان تجربات سے MHD پاور جنریشن کے میدان میں تکنیکی افعالی اور معاشی پیرامیٹرس وجود میں آئیں گے جو اس ٹیکنالوجی کو مزید بہتر اور آخرکار تجارتی طور پر چلانے میں کارآمد ثابت ہوں گے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ MHD ایک اہم پاور جنریشن ٹیکنالوجی ثابت ہوسکتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ، اس ترکیب کے متعلق 1990 کی دہائی کے وسط میں ہی لوگ اس بات کا قیاس کرنے لگے تھے کہ آنے والے زمانے میں اسے تجارتی بنالیا جائے گا۔ MHD کو ترقی دینے کے ضمن میں عالمی طور پر بیداری پیدا ہوئی ہے اور اسے سب سے ضروری اور بڑے پیمانے پر استعمال کیا جانے والا سمجھا جارہا ہے۔ اسے فروغ دینے کی کوشش اس لیے کی جارہی ہیں کہ ضرورت پوری کرنے والے گرڈ کے لیے پاور پیدا کرنے کے رکازی ایندھن پر مبنی نظامات میں توانائی منتقلی کا یہ ایک اصلاح شدہ طریقہ ہے۔ مزید یہ ہے کہ 1970 کی دہائی سے فضا میں آلودگی چھوڑنے پر جیسے جیسے قانونی پابندیاں بڑھتی جارہی ہیں ویسے ویسے ہی رکازی ایندھن سے چلنے والے مروجہ پاور پلانٹ بھی مستحکم انداز میں وجود میں آتے چلے جارہے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ماحولیاتی طور پر MHD ایک صاف نظام ہے اسی کے ساتھ ساتھ یہ زیادہ کارگر، کم آلودگی پیدا کرنے والا توانائی متبادل اور سستی شرحوں پر بجلی پیدا کرنے کا ایسا طریقہ ہے جس سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

ونڈ انرجی ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ کے میدان میں بھی کوششیں کی جارہی ہیں اور موجودہ طور پر ہوا سے چلنے والے پمپ کے نظام کو بہتر بنایا جارہا ہے۔ نئے ہوائی ملوں کی ڈیزائن کاری کی جارہی ہے اور چھوٹے بیٹری چارجروں اور ہوائی برقی جنریٹروں کو فروغ دیا جارہا ہے۔ 12-UP-500 ونڈمل کے ڈیزائن پر نظرثانی کی گئی تاکہ مطلوبہ فرائض کی ادائیگی کے ضمن میں موجودہ ڈیزائن کی موزونیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اس نظرثانی کرنے کی بدولت ہی اس ڈیزائن کی کچھ کمزوریاں سامنے آئیں اور اس کی بنا پر ہی مختلف ذیلی نظامات جیسے پمپ، ٹرانسمشن اور فرلنگ میکانیت میں ضروری اصلاحات کی گئیں تاکہ ان کی کارکردگی بہتر اور زیادہ بھروسہ مند ہوجائے۔ گجرات میں ایک نئے قسم کا 12-UP-500 ونڈمل تیار کیا گیا ہے اور اس نئے ڈیزائن کو میدان عمل میں شدت سے آزمانے کی تجویز پاس کردی گئی ہے۔

نیشنل ایئرو ناٹیکل لیبارٹیری (NAL) کی کفالت سے بادبانی قسم کے ہوائی ملوں کو نمیٹ کرنے اور فروغ دینے والا ایک پروجیکٹ چل رہا ہے۔ اس کے تحت ''ٹریپ زوئڈل'' بادبانی قسم کے ایسے راٹر کے مختلف مشکلات کو ایک ایک کرکے آزمایا گیا کہ جس میں باقاعدگی لانے کے لیے ''سیلف اکٹی ویٹیڈ نون اسپائلر'' ترکیب موجود ہو۔ اس ترکیب نے ''ونڈ ٹنل تجربات'' میں اہم توقعات وابستہ کرائی تھیں۔ بادبانی قسم کے ابتدائی نمونوں سے جو تجربات حاصل ہوئے ان کی بنا پر بادبانوں کو 7.5 میٹر قطر اور تین پنکھڑیوں والے اس راٹر سے تبدیل کردیا گیا کہ جس کی ڈیزائن کاری 4:0 نسبت والی ''ٹپ اسپیڈ'' کے لیے کی گئی تھی۔ اس راٹر کو ایک HP 2 والے سینٹری فیوگل پمپ سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے اسٹارٹ ہونے کی چال 13-12 کلومیٹر فی گھنٹہ اور شرح شدہ چال 22-21 کلومیٹر فی گھنٹہ پہنچ جاتی ہے جب کہ یہ پمپ 21000 لیٹر فی گھنٹہ مائع باہر نکالتا ہے۔ 16 کلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ کی ہوائی چالوں پر اس کی آؤٹ پٹ خاص طور پر زیادہ ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ یہ ہوائی مل ان علاقوں کے لیے نہایت موزوں ہے جو ہوائی علاقوں میں واقع ہیں۔ یہ ہوائی مل اگست 1985 کے آخر سے کام کرتا آرہا ہے۔ ابتدائی تجربات سے اس میں باقاعدگی کی کافی اہلیت پائی گئی ابتدائی طور پر میدان عمل میں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے چار ایسے ونڈمل نصب کیے جانے ہیں جن کے راٹر اور گیئر بکسوں میں تھوڑی سی تبدیلی کی گئی ہے۔ □□□

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دوجلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپے مجلد، 336 روپے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح واضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپے مجلد، 410 روپے غیر مجلد

تحقیق وترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کرلینا آسان ہوگیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جاسکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

اردو خبر نامہ

کل ہند اردو کتاب میلہ — پٹنہ

● قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے بہار اردو اکادمی پٹنہ کے اشتراک سے 17 نومبر سے 25 نومبر تک کل ہند اردو کتاب میلے کا انعقاد مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں کیا گیا۔ جلسے میں ہندوستان گیر پیمانے پر 60 پبلشروں نے حصہ لیا۔ اس کل ہند اردو کتاب میلے کا سلسلہ نومبر 2000 میں دہلی کے لال قلعے کے میدان میں شروع کیا گیا تھا پھر یکے بعد دیگرے دہلی وممبئی میں دو بار اور سری نگر، حیدرآباد، لکھنؤ وکلکتہ میں ایک بار منعقد کیا گیا۔ کونسل کا یہ تجربہ کتابوں کی نمائش اور فروخت کا موثر ذریعہ بن چکا ہے۔

مرکز کی متحدہ ترقی پسند محاذ نے اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیمی ترقی کے لیے اپنے مشترکہ پروگراموں میں ان امور پر زور دیا ہے کہ وہ آئین کی دفعات 245 اور 247 کے تحت اردو زبان کی حیثیت کو تسلیم کرنے اور اسے فروغ دینے کی کوشش کرے گی۔ علاوہ ازیں حکومت ہند اقلیتی طبقوں میں جدید اور تکنیکی تعلیم کے فروغ پر خاص توجہ دے گی۔ حکومت ہند کی سرپرستی میں اردو کے کاز کو عام کرنے نیز اس کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائے جارہے ہیں تاکہ اردو والے بھی اپنی مادری زبان میں زیادہ سے زیادہ بنیادی تعلیم حاصل کرسکیں۔ کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی، خطاطی اور دو سالہ ڈپلوما کورس ان فنکشنل عربی کے ذریعے جہاں اردو والوں کو روزگار سے جوڑنے کی کوشش جاری ہے وہیں دوسری جانب ریاستی اردو اکادمیوں اور اردو اداروں کے ساتھ بھی، رابطے کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اردو کی کلاسیکی وجدید کتب کی اشاعت اور ان کو اردو والوں تک پہنچانے کا بیڑا بھی قومی اردو کونسل نے کتاب میلے کے ذریعے اٹھایا ہے جسے بڑی حد تک کامیابی ملی ہے۔

کتاب میلوں کے انعقاد سے کتابوں کی نمائش اور فروخت کے ساتھ ساتھ اردو کلچر کا فروغ بھی ہورہا ہے۔ ان میلوں کے دوران مختلف ادبی وثقافتی پروگرام جیسے سیمینار، سمپوزیم، مشاعرے، شام غزل، تقریری مقابلے، مباحثے، ڈرامے، طلبہ وطالبات کے لیے انعامی مقابلے اور تخلیق کاروں سے ملاقات کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔

17 نومبر سے 25 نومبر 2007 تک پٹنہ میں منعقد اس کتاب میلے کا افتتاح عالی جناب آر۔ ایس۔ گوگوئی گورنر بہار نے کیا۔ اس موقع پر ڈائرکٹر قومی اردو کونسل ڈاکٹر علی جاوید بھی موجود تھے۔ میلے میں مختلف ادبی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس سلسلے میں 20 نومبر کی شام کو اردو اکادمی پٹنہ کے اشتراک سے ''مشاہیر کے ساتھ ایک شام'' کا اہتمام مدرسہ شمس الہدیٰ کے تاریخی ہال میں کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر وہاب اشرفی نے کی۔ دیگر اہم شرکا تھے پٹنہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر محی الدین، ڈاکٹر شمشاد حسین، اردو اکادمی کے نائب صدر ڈاکٹر غیاث الدین، ڈاکٹر عبدالواحد انصاری، مولانا ابوالکلام قاسمی پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ، فخرالدین عارفی جنرل سکریٹری حلقۂ ادب بہار اور شہزاد انور انصاری سکریٹری بہار اردو اکادمی، پٹنہ۔

پروفیسر وہاب اشرفی نے اپنے صدارتی خطبے میں اردو زبان کو درپیش مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ قومی اردو کونسل نے پٹنہ میں کتاب میلے کا انعقاد کرکے اپنے فرض کی ادائیگی کی ہے۔ اب یہاں کے اردو عوام کا فرض ہے کہ وہ اس میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہوں اور کتابوں کی خریداری کریں تاکہ عملی طور پر اردو زبان وادب کا فروغ ممکن ہوسکے۔ 21 نومبر کو کتاب میلے کے دوران مدرسے کے ہال میں ایک مشاعرے کا بھی انعقاد ہوا جس میں پٹنہ اور اطراف پٹنہ کے تقریباً 30 شعرا شریک ہوئے۔ جن شعرا کو سامعین نے داد سے نوازا ان کے اسمائے گرامی ہیں سلطان اختر، شفیع مشہدی، ڈاکٹر شکیب ایاز، شان الرحمٰن، خورشید اکبر، اعجاز کمار بیباک، خورشید اکبر، ناشاد اورنگ آبادی، اسرار جامعی، اشونی کمار اشرف، ناشاد اورنگ آبادی اور تفضیل احمد وغیرہ۔

25 نومبر میلے کا آخری دن تھا۔ میلے میں کثیر تعداد میں لوگوں کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھی کہ میلہ کامیاب ہوا۔ اختتامی تقریب میں شہر کی معزز علمی، ادبی وسیاسی شخصیات نیز طلبہ وطالبات کی کثیر تعداد موجود تھی۔ سب سے پہلے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد نے اردو کے فروغ کے لیے قومی اردو کونسل کے ذریعے چلائے جارہے متعدد اسکیموں اور نئے عزائم پر روشنی ڈالی، پھر بہار اردو اکادمی کے سکریٹری شہزاد انور انصاری نے اس اردو کتاب میلے کے دوران منعقد کیے گئے مختلف علمی، ادبی وثقافتی پروگراموں کا تذکرہ کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کی اس کوشش کو بہار کے اردو والوں کے لیے ایک بہتر موقع بتاتے ہوئے اس اردو کتاب میلے کو اپنے ابتدائی دور کی پہلی اور کامیاب کوشش قرار دیا۔ اس کے بعد خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر امتیاز احمد نے ذاتی طور پر قومی اردو

کونسل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس اردو کتاب میلے کے انعقاد سے خدا بخش لائبریری کو اچھی کتابیں حاصل ہوگئی ہیں۔ انھوں نے کتاب میلے کو بہار میں پہلا مگر کامیاب تجربہ قرار دیا۔ بعد ازاں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے اس اردو میلے کی کامیابی کے لیے بہار کے اہل اردو، تمام ناشرین، منتظمین بالخصوص مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، بہار اردو اکادمی اور خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بہار میں قومی اردو کونسل کا علاقائی دفتر کے قیام کے سلسلے میں اپنے عزم کا اعادہ کیا۔ انھوں نے صدر جلسہ ڈاکٹر شمبھو شرن شری واستو رکن بہار قانون ساز کونسل اور پروفیسر اسلم آزاد سے اس سلسلے میں حکومتی سطح پر تعاون کی اپیل کی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ملک کی تمام ریاستوں میں قومی اردو کونسل کا ایک ایسا علاقائی دفتر قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں علاقائی دفتر کے ساتھ ایک بڑی لائبریری، آڈیٹوریم اور اردو کی تعلیم کے لیے ایک وسیع درسگاہ کا نظم ہو۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے کونسل کی جانب سے جو منصوبے چلائے جارہے ہیں ان میں کہیں کوئی ناکامی یا کوتاہی نظر آئے تو بلا تامل اس کی نشاندہی کریں۔ اس مجلس کے صدر ڈاکٹر شمبھو شرن شری واستو نے اپنے صدارتی خطبے میں اردو کو ملک کی آزادی کے لیے مرمٹنے والے بھگت سنگھ جیسے شہیدوں کی زبان بتاتے ہوئے اس کے فروغ کے لیے ہر ممکن تعاون فراہم کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر اسلم آزاد اور ڈاکٹر خورشید انور جیسے دوسرے اردو دوستوں کے ساتھ مل کر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کے ذریعے پیش کیے گئے اردو کے اس مقدمے کو وزیر اعلیٰ کے سامنے پوری مضبوطی کے ساتھ پیش کریں گے اور انھیں توقع ہے کہ حکومت بہار قومی اردو کونسل کے علاقائی دفتر کے قیام کے لیے سنجیدہ اقدام کرے گی۔

اختتامی تقریب کے دوران ان طلبہ وطالبات کو انعامات سے نوازا گیا جنھوں نے کتاب میلے میں منعقد مباحثے میں پہلا دوسرا اور تیسرا مقام حاصل کیا تھا۔ اس موقع پر کریسنٹ پبلی کیشن نئی دہلی کو کتابوں کی بہترین نمائش اور ادارہ کتاب الشفا نئی دہلی کو بہترین مجموعۂ کتب کے لیے انعامات سے نوازا گیا۔ پروفیسر لطف الرحمٰن نے اختتامی تقریر فرمائی اور بہار اردو اکادمی پٹنہ کے سکریٹری ڈاکٹر عبدالواحد انصاری نے کتاب میلے کے انعقاد کے لیے قومی اردو کونسل اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

1857 کی جنگ آزادی کو نئے نظریے سے دیکھنے کی ضرورت

● الٰہ آباد۔ 7دسمبر،قومی اردو کونسل اور شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی کے اشتراک سے دو روزہ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ اس بغاوت کو محض رسمی طور پر یاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جو جنگ 1857 میں لڑی گئی تھی وہ آج بھی بدلی ہوئی شکل میں لڑی جارہی ہے۔ نوجوانوں کو سوچنا چاہیے کہ آج کے حالات کیا ہیں اور ان سے کیسے نپٹا جاسکتا ہے۔ قومی اردو کونسل دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ ہم مسائل سے گھبراتے نہیں ہیں۔ کل بھی ہم ان سے نبٹے تھے اور آج بھی نبٹیں گے۔ اس یونیورسٹی کو ماضی کی شان واپس لانی ہوگی۔ یہاں فراق کی یادگار قائم ہونی چاہیے۔ ہم تاریخ کا مطالعہ ماضی کا تجزیہ کرنے کے لیے کرتے ہیں اور پھر مستقبل کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ ہمیں 1857 کی عوامی تاریخ رقم کرنی چاہیے۔ یہ لڑائی اردو میں لڑی گئی تھی آرکائز کے دستاویز اس کے بین ثبوت ہیں۔

الٰہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر آر۔جی۔ ہرشے نے کہا کہ اس سیمینار سے شعبۂ اردو کے وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ اس شعبے کی اپنی تاریخ ہے اسے ہر طرح کی سہولت دی جائے گی۔ 1857 کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ بغاوت اس لیے ہوئی کہ مشنری نے سرمایہ داری کو پھیلانا شروع کیا۔ عیسائیوں کے ہاتھوں میں بائبل تھی اور ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں زمین۔ پھر کچھ یوں ہوا کہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں بائبل آگئی اور زمین نکل گئی۔ چنانچہ کمزور ہوجانے کی وجہ سے ان کا استحصال ہونے لگا۔ حیرت یہ ہوتی ہے کہ اتنا بڑا ملک اتنے کم لوگوں کے ہاتھ میں کیسے چلا گیا۔ شاید ہم بیدار نہ تھے اور بکھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ایک زبان ہی نہیں ایک تہذیب بھی ہے۔ امریکہ سے آئے ہوئے ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی نے اپنے افسانوں میں شامل ہندوستان کی تاریخ وتہذیب کا ذکر کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ پروفیسر افغان اللہ صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی نے اپنا مقالہ بعنوان ''غیر ملکی دانشور اور 1857'' پیش کیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر سید محمد عقیل نے کہا کہ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ 1857 کی جنگ میں الٰہ آباد کا کیا رول رہا، اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور کام کیا جائے۔ الٰہ آباد تو مرکز رہا ہے۔ خسرو باغ سے بغاوت کا آغاز ہوا تھا۔ لہٰذا الٰہ آباد کی مقامی تاریخ کو ازسر نو لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ ابتدا میں پروفیسر لوشا بہ سردار نے مہمانوں کا استقبال کیا اور پروفیسر علی احمد فاطمی نے جلسے کی نظامت کی۔

دو روزہ سیمینار کے پہلے اجلاس میں پہلا مقالہ محترمہ شویہ ودیدی نے پیش کیا، ''1857 کی تحریک آزادی اور صنف نازک''، دوسرا مقالہ ''ڈاکٹر فاضل ہاشمی نے بعنوان ''بہادر شاہ ظفر ذاتیات کے حوالے سے''، تیسرا مقالہ بعنوان ''جنگ آزادی کی جدوجہد اور اودھ'' پروفیسر محمود الحسن نے پیش کیا اور کہا کہ انگریزوں نے اودھ پر قبضہ ضرور کرلیا لیکن تہذیب پر قبضہ نہ کرسکے۔

ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی نے ''جنگ آزادی میں علما کا حصہ'' اور پروفیسر سید محمد عقیل نے ''ظفر اپنے غم کی آگ میں'' عنوان کے تحت ان کی صوفیانہ شاعری پر مقالہ پیش کیا۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے شعبۂ ہندی کے سابق صدر پروفیسر راجیند رکمار نے کہا کہ موضوع کی مانگ ہے کہ دونوں جہتوں سے جائزہ لیا جائے۔ ادب میں تاریخ کے پہلے صفحات نہیں ہوتے یہ آج بھی کارآمد ہے اسے پڑھیے تو آج بھی خون میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔

دوسرے اجلاس کی صدارت شعبۂ تاریخ کے صدر پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی نے کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے کہا کہ ''ماضی کو کیوں سمجھیں تاریخ کو کیوں پڑھیں۔ یہ ہماری یادداشت ہے اور انسان اپنی یاد سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ قوم کی پہچان تہذیب سے ہوتی ہے اور فرد کی یاد سے اس لیے تاریخ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ 1857 کی بغاوت ہمارے سیاسی شعور کا پہلا موڑ ہے۔ 1857 نہ ہوتا تو 1947 بھی نہ ہوتا۔''

اس سے قبل ریسرچ اسکالر منجے کمار نے چلبست کی انقلابی شاعری پر مقالہ پیش کیا۔ بنارس ہندو یونیورسٹی سے آئے مہمان ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے جنگ آزادی اور اردو صحافت کے موضوع پر مقالہ پڑھا اور آخری مقالہ شعبۂ فارسی کے پروفیسر عبدالقادر جعفری نے مولوی لیاقت علی سے متعلق پیش کیا۔ پہلے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر صالحہ زریں نے اور دوسرے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر عزیزہ بانو نے کی۔ بحث میں حصہ لینے والوں میں محمد ہادی، احسان حسن، ڈاکٹر علی احمد فاطمی اور پروفیسر قمر رئیس وغیرہ خاص تھے۔

(ڈاک سے)

1857 اور اردو زبان و ادب

● دہلی۔ 28 نومبر، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں بہ تعاون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ساہتیہ اکادمی اور دہلی اردو اکادمی دو روزہ بین الاقوامی سیمینار بعنوان ''انقلاب 1857 اور اردو زبان و ادب'' منعقد ہوا۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ جناب سید شاہد مہدی نے کہا کہ ہندوستان کی جدید تاریخ میں 1857 ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ تاریخ بغیر اردو زبان کے مطالعے کے مکمل نہیں ہوسکتی۔ نیشنل آرکائیوز میں بیس ہزار دستاویزات محض اردو اور فارسی میں 1857 کی جدوجہد آزادی سے متعلق موجود ہیں جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ قبل ازیں صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابن کنول نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ آج پورا ملک پہلی جنگ آزادی کی یادگار منا رہا ہے لیکن ہم اردو والوں کو اس بات پر فخر ہے کہ یہ جنگ اردو زبان کے ذریعے لڑی گئی۔ افتتاحی اجلاس کا کلیدی خطبہ سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی پروفیسر حامدی کاشمیری نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ جب ہم غالب، حالی، فرمان علی بیگ، میر مہدی مجروح، داغ دہلوی اور دیگر شاعروں اور ادیبوں کی تحریریں پڑھتے ہیں تو 1857 کی جنگ آزادی کی بھرپور تصویر سامنے آجاتی ہے۔ انھوں نے آزادی کی جدوجہد کے حوالے سے اقبال، جوش اور حسرت کا بھی ذکر کیا۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ دہلی یونیورسٹی نے تحقیق و تدوین میں بڑی خدمات انجام دی ہیں، اب 1857 کی دستاویزات پر بھی شعبے کو کام کرنا چاہیے۔ اس دو روزہ سیمینار میں ملک اور بیرون ملک کے متعدد نامور ادیبوں نے مقالات پیش کیے۔ پروفیسر ظہیر الدین (جموں)، پروفیسر محمد زماں آزردہ (سری نگر)، پروفیسر بیگ احساس (حیدرآباد)، پروفیسر حنیف نقوی (بنارس)، پروفیسر اقتدار حسین صدیقی (علی گڑھ)، ڈاکٹر اقبال مرزا (لندن)، جناب کشمیری لال ذاکر (چنڈی گڑھ)، جناب ع۔ واحد (ترکی)، ڈاکٹر جمیل اصغر (پاکستان) پروفیسر عبدالحق، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر عزیز الدین حسین، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر محمد شاہد حسین، ڈاکٹر ظہور صدیقی، محترمہ ترپیر اری شرما، ڈاکٹر توقیر احمد خاں، جناب ذاکر حسین، ڈاکٹر ارجمند آرا اور ڈاکٹر رضوان قیصر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر نجمہ رحمانی، ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر زاہد الحق، ڈاکٹر شریف احمد، ڈاکٹر ارشاد نیازی اور ڈاکٹر تنویر حسن نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس موقع پر غالب کے خطوط جناب انیس اعظمی نے پیش کیے اور ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی نظم 1857 کو ببرو پ نے ڈرامائی شکل میں پیش کیا۔ (ڈاک سے)

ہم عصر اردو تحقیق وتنقید معیار و وسائل پر سہ روزہ سیمینار

● نئی دہلی۔ 7 دسمبر، دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام ''اردو گھر'' آئی۔ ٹی۔ او۔ میں آج ''ہم عصر اردو تحقیق وتنقید معیار و وسائل'' کے عنوان سے کل ہند سہ روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ 9 دسمبر تک چلنے والے سیمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے کی جب کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ افتتاحی خطبہ پروفیسر وہاب اشرفی نے دیا، پروفیسر قمر رئیس نے تعارفی کلمات ادا کیے اور نظامت پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کی۔ اس موقع پر بڑی تعداد میں ادیب و دانشور موجود تھے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ انگریزوں نے تقریباً 300 سال ہماری تہذیب وتمدن اور شناخت کو مسخ کیا اور ہمیں اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ہم آزادانہ طور پر غور وفکر کریں، اپنی تہذیب وشخص کو پہچانیں اور اپنی ایک شناخت قائم کریں۔ انھوں نے اردو

زبان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ تقریباً پورے ایشیا میں کوئی زبان اردو کی برابر اثر انداز، شیریں اور کیوٹیل نہیں ہے۔ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کی بات محض دھوکہ ہے، بلکہ زبان کو تب فائدہ ہوگا جب حقیقتاً اس سمت میں سنجیدہ قدم اٹھائے جائیں گے۔ پروفیسر قمر رئیس نے تمام مہمانان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس سہ روزہ سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہماری زبان آج جس بحران کا شکار ہے ایسے میں اس کی ترویج و ترقی کے لیے ہم جو کام کریں اس میں ذاتی نام و نمود کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے زوال کے سبب ہماری تحقیق و تنقید اور تخلیقی ادب متاثر ہوا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے اپنی تقریر میں کہا کہ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی پالیسیوں کے سبب اردو تحقیق و تنقید کا معیار متاثر ہوا ہے۔ انھوں نے پاکستان کے تعلق سے کہا کہ وہاں تحقیق کا معیار بہتر ہے لیکن تنقید کا حال وہاں بھی ابتر ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

عوامی حکایات اور روایت کے موضوع پر چار روزہ سیمینار

● نئی دہلی۔ 7 دسمبر، فاؤنڈیشن آف سارک رائٹرس اینڈ لٹریچر کے زیر اہتمام ''عوامی حکایات اور روایت'' کے موضوع پر ہونے والے چار روزہ پروگرام میں میلے اور سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ اکیڈمی آف فائن آرٹس سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر نہال رودرگیو (سری لنکا) نے جنوبی ایشیا میں لوک روایات اور ثقافت کی اہمیت کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے لوک روایات کے زوال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ لوک روایات کو موجودہ تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے گذشتہ مہینے کولمبو میں منعقد ہونے والی فوک نمائش کا بھی تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر جواہر لال ہانڈو نے کلیدی خطبے میں کہا کہ پورے برصغیر میں لوک روایات کی بنیادیں تقریباً یکساں ہیں۔ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ کس طرح ہم لوک روایات کو عام لوگوں کے فائدے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں اور ان سے وابستہ سماج کے لیے منفعت بخش بنا سکتے ہیں۔ سادھنا نہال نے کہا کہ ہم لوک روایات کے تحفظ، اہمیت اور بقا کی باتیں تو کرتے ہیں، حکومتیں اور ادارے ان کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال بھی کرتے ہیں لیکن لوک روایات کے حامل افراد کی فلاح و بہبود کے لیے ہم نے کیا کیا یہ بھی ہمیں سوچنا ہوگا۔ آج لوک روایات کے حاملین افراد بدترین حالات میں ہیں اور انھیں زندگی کی بنیادی ضروریات بھی میسر نہیں۔ جمیل احمد (پاکستان) نے عوامی روایات کے مختلف پہلوؤں خاص طور پر ثقافت، تعلیم، مذہب، روایتی کہانیاں اور ان کے سیاسی و سماجی پس منظر کو اجاگر کرنے پر زور دیا۔ فاؤنڈیشن آف سارک کی صدر اجیت کور نے فاؤنڈیشن کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کلیدی خطبے کے بعد بحث کا آغاز کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ تمام سارک ممالک کو چاہیے کہ وہ اپنی ثقافت کی وزارتوں کو اس پر خاص توجہ دینے کے لیے ابھاریں۔ سیمینار میں پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، مالدیپ، نیپال، فن لینڈ اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے عوامی روایات کے ماہرین اور اسکالرس نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

سجاد ظہیر پر سہ روزہ قومی سیمینار

● کلکتہ۔ 18 نومبر، مغربی بنگال اردو اکادمی کی جانب سے ''سجاد ظہیر: حیات و کارنامے'' پر مشتمل سہ روزہ قومی سیمینار کرایا گیا۔ اس کامیاب سیمینار کے لیے اکادمی کی وائس چیئر مین ڈاکٹر شہناز نبی مبارکباد کی مستحق ہیں۔ آج صبح کو تیسرا اجلاس ''سجاد ظہیر: علمی و ادبی کارنامے'' پر مشتمل تھا جس کی صدارت پروفیسر شفیع شیخ نے کی۔ مقالہ نگاروں میں پروفیسر حسین الحق، جناب انیس رفیع (لندن کی رات کا تنقیدی جائزہ)، اشفاق احمد (سجاد ظہیر بحیثیت شاعر)، ڈاکٹر شکیل خاں (روشنائی کا تنقیدی جائزہ)، عمر غزالی (پگھلا نیلم کا تنقیدی جائزہ) نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس سیشن میں نظامت ندیم احمد نے کی۔

دوسرے سیشن کی صدارت پروفیسر حسین الحق نے کی، مقالہ نگاروں میں پروفیسر شفیع شیخ (سجاد ظہیر اور شعری جمالیات)، پروفیسر حسین الحق (سجاد ظہیر اور ترقی پسند ادبی تحریک)، جناب ابوذر ہاشمی (سجاد ظہیر کا اسلوب)، ڈاکٹر شمشیر عالم (سجاد ظہیر: بحیثیت نظم نگار) نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے اور نظامت جناب کلیم حاذق نے کی۔

صبح کے اجلاس میں انیس رفیع کے مقالے پر دلچسپ بحث چھڑی اور پروفیسر حسین الحق نے ان کے کئی نکتوں پر اعتراضات کرتے ہوئے اس کی تصحیح کی۔

جناب انیس رفیع کے مقالے پر جناب ظہیر انور اور جناب ابوذر ہاشمی نے بھی اچھی بحث کی۔ ابوذر ہاشمی نے اپنا مقالہ ''سجاد ظہیر کا اسلوب'' پیش کیا۔ اکادمی کے سیکرٹری جناب افضال احمد نے سیمینار کے اختتام پر سامعین اور مدعوئین کا شکریہ ادا کیا۔ (آزاد ہند، کولکاتا)

''اردو ہندی کی کہانی''

● نئی دہلی۔ یکم دسمبر، غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام ''اردو ہندی کی کہانی ایک شام'' کا انعقاد آج غالب اکیڈمی میں کیا گیا جس کی صدارت جوگندر پال نے کی اور نظامت ڈاکٹر عقیل احمد نے کی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ یہ بھی سازش میں ہی شمار کیا جا سکتا ہے کہ آج اردو مدرسوں کی زبان بھی جا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ زبان ظلم و زیادتی کے خلاف روز اول سے آواز اٹھاتی رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندی زبان بھی اس میں شامل ہو۔ انھوں نے کہا کہ مشترکہ تہذیبی زبان اردو کی حفاظت نہایت ہی ضروری ہے۔ امتیازی کامیابی حاصل کرنے والے کیلی گرافی سینٹر کے طلبہ کو انعام دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ماضی کی تاریخ میں جھانکتے ہوئے روشن مستقبل کو ہموار کرنے کی کوشش کیجیے۔ اس سینٹر کے دیگر طلبہ کو صدر جلسہ جوگیندر پال نے اسناد پیش کیں۔ پروفیسر گنگا پرساد ومل نے قدیم و جدید ہندی کہانی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کہانی کی روایت پریم چند سے شروع ہوتی ہے۔ اردو، ہندی کی کہانیاں حقیقت میں ہندوستان کی سچائی بیان کرتی ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ہندوستان کی اصلیت کو بھی کہانی میں سمویا جائے تاکہ ذمے داران ہند کو حقیقت سے آگاہی ہوسکے۔ متین امروہوی نے منظوم استقبالیہ پیش کیا۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹری عقیل احمد نے مہمانوں کا استقبال اور شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر رتن سنگھ نے بعنوان ''سون پری''، ڈاکٹر نگار عظیم نے ''مردار''، ڈاکٹر خالد جاوید نے ''مٹی کا تعاقب'' اور طارق چھتاری نے کہانیاں پیش کیں۔ پروگرام میں عبدالعظیم، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر شمس الحق عثمانی، انجم عثمانی، ظہیر برنی، نسیم عباسی، عبدالرحمن ایڈووکیٹ، پونم اوسوال، جیلنا اور وجے یادو سمیت کثیر تعداد میں طلبہ و دیگر لوگوں نے شرکت کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رومی پر سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار

● حیدرآباد۔ 23 نومبر، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی حیدرآباد اور اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے اشتراک سے ''جلال الدین رومی پیمبر امن و محبت'' کے عنوان سے ایک سہ روزہ سیمینار حیدرآباد میں 21-22 اور 23 نومبر کو منعقد کیا گیا۔

افتتاحی اجلاس 21 نومبر کو مدینہ ایجوکیشن سنٹر، نام پلی، حیدرآباد میں رکھا گیا جس کی صدارت جناب اے۔ ایم۔ پٹھان وائس چانسلر مولانا آزاد یونیورسٹی نے فرمائی۔ مہمانانِ خصوصی کونسل جنرل سفارت خانۂ ایران جناب آغا حسین راوش، پروفیسر قمر غفار (شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)، ڈاکٹر فیاض زاہد، (اوپن یونیورسٹی تہران)، جناب علی رضا قزویہ (ایران) اور جناب ٹی پرکاش (رجسٹرار مولانا آزاد یونیورسٹی) تھے۔ ڈاکٹر خالد سعید نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں کہا کہ یونیسکو نے 2007 کو رومی کے نام معنون کیا ہے اور ایسے کئی سیمینار تمام عالم اسلام میں منعقد کیے جا رہے ہیں۔ پروفیسر قمر غفار نے انکشاف کیا کہ یونیسکو نے ہندوستان کو نظرانداز کیا تھا لیکن انھوں نے ذمے داران ادارہ سے گفتگو کرکے دہلی اور حیدرآباد میں رومی پر سیمینار منعقد کیا۔ ڈاکٹر فیاض زاہد نے انگریزی و فارسی میں خطاب کیا۔ علی رضا قزویہ نے بھی فارسی میں خطاب کیا جس کا رواں ترجمہ ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے کیا۔ علی رضا قزویہ نے کہا کہ رومی کا عرفان دراصل شمس تبریزی کا عرفان ہے اور بیدل دہلوی کا بھی وہی عرفان ہے۔ پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان نے رومی کا تعارف کرایا اور ٹی۔ پرکاش رجسٹرار کے کلمات تشکر پر یہ افتتاحیہ اجلاس اختتام کو پہنچا۔

دوسرے دن 22 نومبر کو مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد میں پہلا اجلاس ساڑھے گیارہ بجے شروع ہوا جس میں پروفیسر محسن عثمانی نے رومی کے اردو تراجم کے حوالے سے مقالہ پڑھا اور رومی کے بے شمار اردو تراجم کا ذکر کرتے ہوئے اردو ادب میں رومی کے اثرات کو ایک اضافہ قرار دیا۔

اس اجلاس کے دوسرے مقالہ نگار سید علیم اشرف جائسی نے مشرقی شاعر کی مغربی پیشکش سے بحث کرتے ہوئے کہا کہ مغرب نے رومی کے سلسلے میں اپنے اعتراف کو بھی انکشاف کی طرح پیش کیا ہے۔ رومی سے مساوات و محبت کا درس لینے کے ساتھ ساتھ حق و صداقت کا درس بھی لینا چاہیے۔ رومی کے پاس غنا ایک ذریعہ تھا جسے مغرب نے مقصد بنالیا۔ حالت وجد میں رقص کو ارادی رقص قرار نہیں دیا جا سکتا یہ تو اس رقص کی پیروڈی ہے۔

ڈاکٹر فیاض زاہد نے کہا کہ رومی نے انسان کے درون میں انقلاب کا درس دیا تھا۔ ڈاکٹر رحیم الدین کمال نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ میں اگرچہ فارسی میں شعر کہہ لیتا ہوں مگر ہندوستانی فارسی اور ایرانی فارسی میں بڑا فرق ہے۔ دوسرے صدر علی رضا قزویہ نے کہا کہ ہر وہ کام جو بسم اللہ سے شروع نہیں ہوتا اپنے انجام کو نہیں پہنچتا۔ اسی طرح مثنوی مولوی معنوی بھی بسم اللہ کے بجائے ''بشنو از نے'' سے شروع ہوتی ہے اس لیے ختم ہی نہیں ہو پاتی۔ اردو میں بیشتر الفاظ فارسی کے ہیں اور جب تک پروفیسر قمر غفار صاحبہ جیسی شخصیتوں کی سرپرستی حاصل رہے گی ہندوستان میں فارسی ختم نہیں ہوسکتی۔

چائے کے وقفے کے بعد دوسرا اجلاس شروع ہوا جس میں امتیاز الدین نے انگریزی میں مقالہ پڑھا اور رومی کا اجمالی تعارف کرایا۔ ایرانی مہمان ڈاکٹر مرتضیٰ فلاح نے فارسی میں مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ فارسی و اردو میں ہم آہنگی سے زیادہ قلبی وابستگی ضروری ہے۔ انھوں نے مثنوی میں کوچہ و بازار کی زبان کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ رومی نے اس میں مختلف کمزور طبقات کے محاوروں کو برتا ہے، عام طور پر یہ واعظین کا طریقۂ کار رہا ہے۔ رومی نے بھی مثنوی میں بھکاریوں، سانپ پکڑنے والوں، بھٹیاروں، مزدوروں، پہلوانوں اور معمولی پیشوں سے وابستہ لوگوں کی زبان برتی۔ توہمات اور بدشگونی کے

اعتقادات وغیرہ کا رومی نے ذکر کیا ہے، ایسے اعتقادات وتوہمات ایران میں آج بھی مروج ہیں۔

تنویر الدین خدانمائی نے حقوق بشر مثنوی معنوی میں تلاش کرتے ہوئے حضرت علیؓ کے ایک پہلوان کو پچھاڑنے پر منہ پر تھوکنے والے واقعے کے حوالے سے حقوق بشر اور نفس کے تقاضوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے رومی کی مثنوی کی روشنی میں حقوق العباد اور حقوق اللہ کا ذکر کیا۔

صدر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی پروفیسر قمر غفار نے کہا کہ ''ہست قرآن در زبان پہلوی'' کہنے سے ہمیں گریز کرنا چاہیے کہ اس سے ''قرآن مجید'' کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ قرآن مجید ایک بے مثال کتاب ہے، کوئی شاہکار اس کے جیسا ہو ہی نہیں سکتا۔

اسی دن تیسرا اجلاس مضطر مجاز، تنویر الدین خدانمائی اور عبدالعظیم پویا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے مثنوی میں پائے جانے والے اخلاقی مسائل سے بحث کی۔ رؤف خیر نے رومی کی غزلوں کا جائزہ لیتے ہوئے اور ''دیوان شمس تبریز'' سے مثالیں دیتے ہوئے ان کی خصوصیات کا ذکر کیا کہ رومی کی غزلیں مربوط ومسلسل فکر کی حامل ہیں۔ مطلع سے مقطع تک ان غزلوں میں ایک ہی خیال کی توسیع پیش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر محسن سامع ایرانی نے فارسی زبان میں مقالہ پڑھا اور مثنوی میں مختلف جانوروں اور پرندوں کی آوازوں کی نشاندہی کی اور ان کی معنویت پر روشنی ڈالی۔ ان کا مقالہ اپنی نوعیت کا منفرد اور دلچسپ مقالہ تھا جسے بہت پسند کیا گیا۔ اجلاس کے صدر اول مضطر مجاز نے ان تینوں مقالوں پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ فریس نے مثنوی سے اخلاقی حکایات منتخب کرکے مثنوی کی اخلاقی جہت کو اجاگر کیا ہے۔ رؤف خیر نے رومی کی مشکل غزلوں کا جائزہ لے کر انھوں نے بڑی آسانی سے ان غزلوں کے اثرات اپنے بعض شعر پر دکھائے۔

اسی رات یعنی 22 نومبر کو تاراماتی اسٹیڈیم، حیدرآباد میں انڈیا لوگ فاؤنڈیشن (India Logue Foudation) اور آندھراپردیش ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے زیر اہتمام ''رقص درویشان'' کا دلچسپ پروگرام پیش ہوا جس میں ترکی کے موسیقاروں نے مخصوص لے پر رومی کا کلام پیش کیا۔ کلمۂ طیب لا الہ الا اللہ کی پیش کش بھی موسیقی کی لے پر ہوئی۔ اس کے علاوہ یا رسول اللہ اور یا حبیب اللہ بھی خاص میوزک کے ساتھ گایا گیا اور مولویہ فرقے کے چودہ درویشوں نے ایک مخصوص دھن پر جیران کن رقص پیش کیا۔

سیمینار کے آخری دن یعنی 23 نومبر کو فیروز عالم کی نظامت میں پہلا اجلاس ہوا۔ پروفیسر عراق رضا زیدی نے اشعار مثنوی کا ترجمہ سنایا اور مثنوی کے بسم اللہ سے شروع نہ ہونے کا جواز سورۂ توبہ کے بغیر بسم اللہ شروع ہونے سے پیش کیا جس پر کافی اعتراض بھی کیا گیا کہ ان دونوں میں بھلا کیا مماثلت ہوسکتی ہے؟

ڈاکٹر مظفر شہ میری نے رومی کی مثنوی کے تمثل تراجم کا تفصیلی ذکر کیا۔ ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے مثنوی میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذکر کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد کے اجلاس میں پروفیسر فاطمہ پروین نے ڈی سباراؤ، ین گوپی اور ڈاکٹر دلاور کے حوالے سے مثنوی کے تمثلو تراجم کا اجمالی جائزہ پیش کیا۔ تمثلو مثالیں بھی انھوں نے دیں۔ نورالاسلام صدیقی نے رومی کی سوانح بیان کی۔ اختتامی اجلاس میں تنویر الدین خدانمائی نے سماع اور رقص کو جائز قرار دیتے ہوئے اس کے جواز میں خواجہ معین الدین چشتی کے ساتھ ساتھ امام غزالی کو بھی اپنی حمایت میں گواہ بنایا۔ ضیاء الدین نیر نے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مولانا آزاد یونیورسٹی سے اقبال اکادمی حیدرآباد کے تعاون کا ذکر کیا۔ ضیاء الدین شکیب (لندن) نے اس پورے سیمینار کا مکمل جائزہ لیتے ہوئے اسے کامیاب سیمینار قرار دیا اور پیش کردہ مقالات کو کتابی صورت دینے کا مشورہ بھی دیا (رؤف خیر)

''رومی کی بازیافت'' پر قومی کانفرنس

● نئی دہلی۔ 8 دسمبر، علامہ جلال الدین رومی کے انسان دوستی کے نظریے کو آج کی دنیا میں بھی وہی اہمیت حاصل ہے جو ان کے زمانے میں تھی اور یہ کہ اسے مزید فروغ دیے جانے کی ضرورت ہے۔ اس خیال کا اظہار آبی وسائل کے مرکزی وزیر سیف الدین سوز نے آج یہاں ''علامہ رومی کی بازیافت'' کے موضوع پر ایک قومی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ غور طلب بات ہے کہ آخر رومی کی مثنوی کو زبان پہلوی کا قرآن کیوں کہا گیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ رومی ہر دل کو اپیل کرتے ہیں۔ اس لیے اقبال جیسے فلسفی اور شاعر نے انھیں اپنا روحانی پیشوا بنایا۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ اقبال نے مرد کامل کا تصور بھی رومی سے اخذ کیا ہے۔ واضح رہے کہ اقوام متحدہ نے سال 2007 کو علامہ رومی کی پیدائش کی 800 ویں سالگرہ تقریبات کے لیے وقف کیا ہے۔ اس موقع پر فلم ساز مظفر علی نے کہا کہ علامہ رومی کے ذہن سے دل کے سفر نے مجھے ہلا ڈالا۔ انھوں نے کہا کہ آج کی دنیا میں بھی آرٹس اور سائنس میں ہی نہیں بلکہ تمام شعبوں میں رومی کے پیغام کی یکساں اہمیت ہے۔ انھوں نے کہا کہ علامہ رومی کی شاعری میں مضمر پیغام کو سمجھنا ایک فن ہے جسے اقبال نے سمجھا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں پاکستانی ادیبوں کی آمد

● نئی دہلی۔ 21 نومبر، کسی بھی زبان کو سیاست اور معیشت سے الگ

نہیں کیا جاسکتا خواہ وہ اردو زبان ہی کیوں نہ ہو، اس لیے اردو کے ادیبوں اور دانشوروں کو سیاست اور معیشت کی طرف خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار پنجاب یونیورسٹی لاہور کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اورنگ زیب عالم نے کیا۔ وہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی ادبی و ثقافتی تنظیم ''بزم ادب'' کی جانب سے منعقدہ استقبالیہ تقریب میں بطور مہمان خصوصی اپنے تاثرات پیش کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اورنگ زیب نے مغربی تہذیب اور انگریزی زبان کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آج پوری دنیا میں مغربی تہذیب غالب آتی جارہی ہے جس سے ہم بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے تو جس زبان میں نوکری ملے گی اس زبان کو لوگ زیادہ پڑھنا پسند کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تہذیب و زبان کا ہی اثر ہے کہ جو ہمارے پالیسی میکر ہیں وہ انگریزی میڈیم سے پڑھ کر آتے ہیں اور ان کے بچے بھی انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کو اردو زبان سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا جس کے سبب اردو کو نقصان ہوتا ہے۔ ادبی نظریات پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جب 1947 میں ملک آزاد ہونے کے ساتھ ساتھ تقسیم بھی ہوا تو اس کے بطن سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ دونوں طرف کے ادیبوں نے تقسیم اور فرقہ وارانہ فسادات پر خوب خوب لکھا۔ اس کے بعد پاکستان میں پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی تحریک شروع ہوئی جو کامیاب نہ ہوسکی۔ نئی نسل نے ان دونوں تحریکوں کو مسترد کرتے ہوئے ادب کو ادب کے حوالے سے لکھنا اور پڑھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ انھوں نے انتظار حسین، حبیب جالب، انور سجاد اور کئی دیگر پاکستانی ادیبوں کے حوالے سے اپنی گفتگو مکمل کی۔ اسلام آباد یونیورسٹی کی استاد ڈاکٹر صباحت قمر نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ جب میں ہندوستان آرہی تھی تو میرے والدین مجھے یہاں آنے سے منع کر رہے تھے کیونکہ جس طرح کی غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں، اس سے خوف تو پیدا ہوتا ہے لیکن جو لوگ یہاں آچکے ہیں انھیں معلوم ہے کہ دونوں ممالک کے لوگوں میں کتنا پیار ہے۔ انھوں نے کہا کہ سچ بات تو یہ ہے کہ ملک الگ الگ ہونے سے رشتے نہیں بدل جاتے۔ قبل ازیں صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابن کنول نے پاکستانی ادیبوں کا اساتذہ اور طالب علموں کی جانب سے خیر مقدم کیا۔ انھوں نے کہا کہ سب سے اہم رشتہ زبان کا ہوتا ہے۔ زبان کے حوالے سے بننے والے رشتے بہت ہی مضبوط ہوتے ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتے۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان میں ادب میں جو نئی نسل آرہی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ انھوں نے کہا کہ نئی نسل کی نمائندگی کرنے والی خواتین صباحت قمر (پاکستان) اور ارجمند آرا (ہندوستان) کو تدوین پر کام کرتے دیکھتا ہوں تو کافی خوشی ہوتی ہے۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر توقیر احمد خاں نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر پروفیسر صادق، ڈاکٹر مجیب احمد خاں، ڈاکٹر تنویر حسن، ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈاکٹر اکمل شاداب، علی احمد ادریسی، بزم ادب کے صدر محمد اسحاق، سکریٹری محمد ارشد، عائشہ طلعت، فائزہ، عارف اشتیاق اور نور عالم کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

غالب انعامات برائے 2007

● نئی دہلی۔ 15دسمبر، غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال معتبر ادیبوں، دانشوروں، شاعروں، ڈراما نگاروں کو غالب انعام دیتا ہے۔ اس سال غالب انسٹی ٹیوٹ کی غالب انعام سب کمیٹی کی میٹنگ مورخہ 5نومبر 2007 کو پروفیسر سید احمد حسن عابدی کی صدارت میں ہوئی۔ کافی غور وخوض کے بعد ممبران نے مندرجۂ ذیل دانشوروں کو غالب انعامات برائے سال 2007 منتخب کیا ہے۔

1. فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے اردو تنقید وتحقیق، پروفیسر اکبر حیدری (کشمیر)
2. فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تنقید وتحقیق، پروفیسر وارث کرمانی (دیوا شریف)
3. غالب انعام برائے اردو شاعری، محترمہ شفیق فاطمہ شعریٰ (اورنگ آباد)
4. غالب انعام برائے اردو نثر، جناب بلراج سمنرا (دہلی)
5. ہم سب غالب انعام برائے اردو ڈراما، جناب جاوید صدیقی (ممبئی)
6. غالب انعام برائے مجموعی ادبی خدمات، جناب زبیر رضوی (دہلی)
7. غالب انعام برائے علمی خدمات (سائنس)، جناب شمس الاسلام فاروقی (دہلی)

یہ انعامات مبلغ چالیس ہزار روپے نقد، ایک تمغہ اور سند پر مشتمل ہیں۔ 14دسمبر 2007 کو جشن غالب تقریبات کے افتتاحی جلسے کے موقع پر عزت مآب جناب محمد حامد انصاری نائب صدر جمہوریہ ہند کے دست مبارک سے یہ انعامات پیش کیے گئے۔ (ڈاک سے)

انجمن ترقی اردو گلبرگہ کا جلسۂ تقسیم انعامات

● گلبرگہ۔ 11نومبر، انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے زیر اہتمام خواجہ بندہ نوازؒ ایوان اردو گلبرگہ میں 11نومبر 2007 کو مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش کی مناسبت سے ''یوم تعلیم'' منایا گیا اور ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی۔ امتحان

مارچ 2007 میں اردو میڈیم کے ذریعے ریاستی، امتیازی نمبر حاصل کرنے والے ہونہار طالبات کو گولڈ میڈل، سلور میڈلس، نقد انعامات اور توصیفی اسناد سے نوازا گیا۔ ریاست کرناٹک کی سطح پر گوکاک کی طالبہ منہاج نور محمد چودھری کو جناب قمرالاسلام سابق وزیر حکومت کرناٹک نے 5 ہزار روپے کا نقد انعام پیش کیا۔ علاقہ حیدرآباد کرناٹک کی سطح پر سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے طالب علم کو زاہد علی خان مدیر اعلیٰ روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد کی جانب سے دیا جانے والا گولڈ میڈل بی بی رضا گرلس ہائی اسکول گلبرگہ کی طالبہ خدیجہ ارم محمد الیاس احمد نے اور سیدہ اسریٰ نازنین، سید عبداللطیف شاہین ہائی اسکول، بیدر، وسمیہ فردوس، امیر احمد سوداگر نشیمن گرلز ہائی اسکول گلبرگہ نے ''سیاست سلور میڈلس'' جناب اقبال احمد، سرڈگی، رکن پارلیمان گلبرگہ وصدر البدر ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے ضلع گلبرگہ اسکول کو انعام دوم 1500 روپے اور رضوانہ سلطانہ شیر علی الامین اردو گرلز ہائی اسکول، جیورگی روڈ گلبرگہ کو انعام سوم 1000 روپے پیش کیے گئے۔ انجمن ترقی اردو گلبرگہ ہر سال کی طرح اس بار بھی زبان اوّل اردو میں امتیازی نمبر حاصل کرنے پر سمیہ فردوس کو انعام اوّل، عمارہ رومانہ صادق علی نشیمن ہائی اسکول اور سمیہ انجم محمد سراج نیشنل گرلز ہائی اسکول کو نقد انعامات سے نوازا۔

جلسے کو خطاب کرتے ہوئے جناب اقبال احمد سرڈگی رکن پارلیامنٹ نے مولانا آزاد کی علمی، ادبی، تہذیبی، سیاسی وصحافتی خدمات کا جائزہ اس نوجوان نسل کو ان کے اعلیٰ اقدار سے واقف کرانا ایک اہم فریضہ قرار دیا کیوں کہ ہندوستان کی ترقی وترویج کی بنیاد، ملک کا سیکولر دستور ہے۔ جناب قمرالاسلام سابق وزیر حکومت کرناٹک نے کہا کہ انجمن ترقی اردو گلبرگہ کی فعالیت سارے ملک کے لیے ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا آزاد کے متعلق انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد ان شخصیتوں میں سے ایک تھے جو زمانے کو بدلنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ جناب وہاب عندلیب ڈائرکٹر آف اسٹڈیز خواجہ ایجوکیشن سوسائٹی گلبرگہ نے کہا کہ مولانا آزاد عالمی سطح پر ایک عبقری شخصیت کا نام ہے۔ وہ ہمیشہ سیکولرزم اور ہندو مسلم اتحاد ویکجہتی کے زبردست حامی رہے۔ مختلف اصناف ادب میں ان کا اسلوب نگارش منفرد تھا۔ پروفیسر حمید سہروردی نے کہا کہ مولانا کی شخصیت پہلودار تھی اور ان کی فکر کا سرچشمہ ''قرآن مجید'' اور احادیث ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے علم کو آنے والی نسلوں کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی بنیاد ڈالی۔ صدر اجلاس جناب شریف احمد قریشی صدر انجمن نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ طلبہ عصری تعلیم سے مزین ہوتو رہے ہیں مگر اخلاقی انحطاط کا شکار ہیں۔ اساتذہ اور والدین کو چاہیے کہ اس پر خصوصی توجہ دیں۔ جلسے کا آغاز پروفیسر عبدالحمید اکبر کی قرأت کلام پاک سے ہوا، جناب امجد جاوید نائب صدر انجمن نے مہمانان اور حاضرین کا خیر مقدم کیا، جناب ولی احمد نائب صدر انجمن نے انجمن کے زیراہتمام دیے جانے والے انعامات اور تعلیمی فنڈ کے قیام کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ جناب خواجہ پاشاہ انعامدار معتمد انجمن نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جناب میر شاہ نواز شاہین شریک معتمد کے شکریے پر جلسے کا اختتام ہوا۔ جلسے میں محبان اردو کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

(ڈاک سے)

الامین کمبلپوش کنڑا اسکول میں راجیہ اتسو تقریب

● بنگلور۔ 23 نومبر، شیواجی نگر کی الامین کمبلپوش کنڑا ہائی اسکول میں راجیہ اتسو تقریب کے دوران آج اعزاز حاصل کرنے والے مہمانوں نے الامین تحریک کے بانی ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی خوب ستائش کی اور کہا کہ وہ واقعی اس لائق ہیں کہ انھیں جنوبی ہند کا سرسید احمد قرار دیا جائے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے جہاں تعلیم کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں وہیں اردو کے چمن میں بھی انھوں نے کنڑا کے پھول کھلا کر کرناٹک اور کنڑا سے محبت کا ثبوت دیا ہے۔ الامین کمبلپوش کنڑا ہائی اسکول کی جانب سے 51ویں راجیہ اتسو تقریب ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی صدارت میں منعقد کی گئی اور اس اجلاس کے دوران کرناٹک کے لیے بیش بہا خدمات انجام دینے پر دوردرشن بنگلور کیندر کے ڈائرکٹر مہیش جوشی، چناپداپریشد کے سکریٹری ڈی. چکراشیوشنکر اور روزنامہ ''پاسبان'' کے چیف رپورٹر عبدالخالق کو تہنیت پیش کی گئی۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے صدارتی تقریر میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے کہا کہ میری مادری زبان اردو ہے اور میں نے الامین اداروں کے درمیان یہ کنڑا ہائی اسکول قائم کیا۔ یہ ادارہ ایک منی ہندوستان ہے جہاں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے بچے ہیں۔ ان میں اردوداں، تمل بولنے والے اور تلگو بولنے والے بھی ہیں جو یہاں کنڑا زبان میں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کسی دھرم یا مذہب سے زیادہ زبان میں طاقت ہوتی ہے اور یہ زبان دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ انھوں نے اسکول کے طلبہ اور اساتذہ سے کہا کہ وہ کنڑا کے ساتھ ہی ساتھ یہاں اردو بول چال اور زبان سیکھنے کی جانب بھی توجہ دیں۔ جناب مہیش جوشی نے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی کنڑا دوستی کی خوب ستائش کی اور کہا کہ وہ خود بزرگ شاعر وصوفی ششونال شریف کے بھگت ہیں۔ انھوں نے دلوں کو ملانے کا جو کام کیا ہے ایسے ہی کام جنوبی ہند کے سرسید ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے ریاست کے مسلمانوں میں خود اعتمادی، عزت ووقار اور رہنمائی کے لیے ایک زبردست تعلیمی جال بچھایا ہے۔ وہ اس کنڑا اسکول کے سلسلے میں دوردرشن پر پروگرام پیش کریں گے۔ اس اسکول میں تعلیم پانے والے غریب

بچوں کے لیے انھوں نے 10,001 روپے کا عطیہ بھی پیش کیا اور کہا کہ کرناٹک میں ششونال شریف کے علاوہ فلم انڈسٹری میں ایس. کے. کریم خاں اور نثار احمد جیسے لوگوں نے بھی کنڑ زبان و ادب کے لیے بہت کچھ کیا ہے جبکہ روزانہ چند لوگ صرف اپنے نام وشہرت کے لیے خود کو کنڑا کا بہت بڑا ہمدرد اور رضاکار جتاتے ہیں۔ انھوں نے ششونال شریف کے دکنی اردو کنڑا الفاظ کے مرکب سے لکھی ششونال شریف کے وچن پڑھ کر سنائے۔ جناپد اپریشد کے سکریٹری ڈی چکر اشیوشنکر نے بتایا کہ زندگی کے ہر موڑ پر اس ریاست میں ان کی رہنمائی مسلمانوں نے ہی کی ہے۔ شیواجی نگر جیسے علاقے میں گزشتہ 32 برسوں سے ایک کنڑا ہائی اسکول کامیابی سے چلانے کے لیے دل گردہ چاہیے۔ یہ ایک بڑی قربانی اور کارنامہ ہے جو ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے انجام دیا ہے۔ آج روزانہ ٹی وی اور اخباروں میں کنڑا کا دم بھرنے کے نام پر کئی لوگ ناٹک بازی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں جیسے لوگ حقیقی ہمدردان قوم ہیں۔ زبان اور علم کسی مذہب کی یا شخص کی جاگیر نہیں ہے۔ علم غریب امیر چھوٹے بڑے سبھی کو بانٹنے سے ہی پھلتا پھولتا ہے۔ روزنامہ ''پاسبان'' کے چیف رپورٹر عبدالخالق نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کرناٹک کے مسلم اداروں، انجمنوں میں نئی بیداری آرہی ہے۔ الامین اسکالرشپ کمیٹی کی جانب سے طلبہ و طالبات میں یونیفارم تقسیم کیے گئے۔ محترمہ حسنی غوث شریبی نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور سکریٹری جناب ریاض احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اسکول ٹیچر پدمانابھ نے اسکول کی رپورٹ پیش کی اور بتایا کہ یہ اسکول 1974 میں جب قائم ہوا تو صرف 30 بچے تھے۔ آج 300 بچے یہاں تعلیم پا رہے ہیں۔ اساتذہ چندریکا، انیتا اور مولانا مظفر صاحب نے اعزاز حاصل کرنے والی شخصیات کا تعارف کروایا۔ جناب اقبال حسین، میجر فرید اللہ، جناب جے شفیع اللہ اور جناب سیف اللہ وغیرہ نے بھی اجلاس میں شرکت کی۔ اسکول کے طلبہ و طالبات نے کلچرل پروگرام پیش کیے۔ **(سالار، بنگلور)**

متین طارق کے فن پر یک روزہ سیمینار

● باغپت۔ یکم دسمبر۔ اصلاحی فکر کے حامل معروف قلم کار متین طارق باغپتی کی گراں قدر علمی، ادبی اور تدریسی خدمات کے اعتراف میں ''بزم ادب'' کی جانب سے گذشتہ روز یہاں ایک سیمینار اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت سہ روزہ ''دعوت'' کے مدیر پرواز رحمانی نے کی۔ اسمبلی رکن نواب کوکب حمید مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ متین طارق کی علمی، ادبی اور اسلامی موضوعات پر 54 کتابیں شائع ہوچکی ہیں جب کہ ایک درجن سے زائد مسودات زیر اشاعت ہیں۔ صدارتی کلمات میں پرواز رحمانی نے کہا کہ متین طارق کا فن اور فکر ان کی زندگی کی طرح بامقصد رہی ہے اور انھوں نے اسلام کا پیغام اور تعلیمات بلا امتیاز مذہب تمام برادران وطن تک پہنچانے کی کوشش کی۔ مہمان خصوصی نواب کوکب حمید نے متین طارق کی شخصیت کو ایک مکمل ادارے سے تعبیر کیا اور ان کی بے لوث انسانی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے ان کی موجودگی کو تقویت بخش قرار دیا۔ معروف کالم نویس جناب عظیم اختر نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ باغپت اور قرب و جوار میں متین طارق کے دم سے علم کی روشنی پہنچی ہے۔ ڈاکٹر شہپر رسول نے متین طارق کی غزل گوئی کو موضوع گفتگو بناتے ہوئے کہا کہ ان کے یہاں سادگی کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائی پر فنی دسترس اور تغزل بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے متین طارق کی منظوم سیرت نگاری پر تبصرہ کیا اور انھیں شاعر انسانیت قرار دیا۔ ڈاکٹر خالد حسین نے متین طارق کی تصنیف ''روشن چراغ'' کو فکر وتحقیق کا ایک دل نشیں اسلوب بتایا۔ سید عاصم علی سہم واری نے متین طارق سے اپنی دیرینہ رفاقت کا ذکر کیا اور ان کے خدمت خلق کے جذبے کی تعریف کی۔ جماعت اسلامی میرٹھ کے صدر رشید الدین نے ان کے خانوادے کے اس صالح ماحول پر روشنی ڈالی جس میں آپ کی تربیت ہوئی۔ دعوت ٹرسٹ کے سکریٹری رفیق احمد نے کہا کہ متین طارق نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کا استعمال انسانی فلاح و بہبود کے لیے کیا ہے۔ اجمل فاروق ندوی نے ان کی سیرت نگاری پر گفتگو کی۔ اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے متین طارق باغپتی نے اپنے علم اور فن کو ماں کی تربیت کا نتیجہ بتایا۔ انھوں نے ان محرکات پر بھی روشنی ڈالی جنھوں نے علمی، ادبی، تدریسی اور انسانی خدمات کے جذبے سے انھیں سرشار کیا۔ اس تقریب میں متین طارق کی نظموں کے تازہ مجموعے ''شمع عرفان'' کی رسم رونمائی بھی کی گئی۔

رات کو حاجی اکرام اللہ کی صدارت میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں نواب کوکب حمید کے علاوہ سابق ریاستی وزیر ڈاکٹر معراج الدین مہمان خصوصی کے طور پر تھے۔ مشاعرے میں مظفر رزمی، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر تابش مہدی، نواز دیوبندی، نعیم اختر خادمی، ذکی طارق، عقیل نعمانی، خورشید حیدر، عزم شاکری، معین شاداب، تحور بدایونی، رستم رامپوری، شمس عالم شمس، انا دہلوی، نزہت امروہوی، ضیا باغپتی اور خوشتر باغپتی وغیرہ نے شرکت کی۔
(ہندستان ایکسپریس، دہلی)

مختصرات

●رانچی۔ 12 نومبر، کو مرکز ادب و سائنس بریاتو ہاؤسنگ کالونی میں مولانا ابوالکلام آزاد کے 119 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر ایک علمی و ادبی

جلسہ اور طلبہ و طالبات کے درمیان تقریری مقابلے کا انعقاد کیا گیا جس کا عنوان ''جنگ آزادی کے ایک عظیم مجاہد و دانشور مولانا ابوالکلام آزاد'' تھا۔ اس مقابلے میں ٹرسٹ کے پانچوں یونٹوں کے مسلم و غیر مسلم طلبہ و طالبات نے پورے جوش و خروش سے حصہ لیا اور اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں مولانا سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان کی شخصیت اور کارنامے کو اجاگر کیا گیا۔

مقابلے کو جانچنے کے لیے آئے مہمان شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی کے اردو کے ریڈر ڈاکٹر منظر حسین، ڈورنڈا کالج کے شعبۂ اردو کی ریڈر ڈاکٹر کہکشاں پروین اور SIIT کے انسٹرکٹر جناب جاوید تشریف فرما تھے جنھوں نے اس مقابلے کا نتیجہ سنایا۔ اردو، ہندی اور انگریزی کے مقرروں میں اولین نام SCTGC کی غزالہ پروین کا تھا۔ SIIT کی فرحین نور اور اشتیاق خاں کو پہلا انعام دیا گیا۔ اسی طرح SIIT کے محمد طیب، CTTC کی سرسوتی کماری اور SCTGC کی نیا پروین کو بالترتیب دوسرے درجے کے انعامات سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر منظر حسین نے اپنی تقریر میں مولانا آزاد کی دانشورانہ حیثیت کو اجاگر کیا۔ ڈورنڈا کالج کی ریڈر ڈاکٹر کہکشاں پروین نے کہا کہ ''مولانا آزاد جیسی شخصیتیں اپنے کارناموں سے نئی تاریخ بناتی ہیں۔ انھیں صرف رسمی طور پر یاد نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' ٹرسٹ کے بانی چیئرمین ڈاکٹر احمد سجاد نے مولانا آزاد سے متعلق دو واقعات کے حوالے سے ماضی و حال کے سیاسی اکابرین کا موازنہ کرتے ہوئے مولانا مرحوم کی اخلاقی برتری کو واضح کیا۔ صدر جلسہ پروفیسر ابوذر عثمانی نے اپنی صدارتی تقریر کے دوران کہا کہ قومی یکجہتی، لسانی بصیرت اور سیاسی جدوجہد کے میدانوں میں ان کی نظیر مشکل ہے۔ جن کی عظمت کا اعتراف مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو، محمد علی جوہر اور خواجہ غلام السیدین جیسے اکابرین نے بھی کیا ہے۔''
(ڈاک سے)

● کٹیہار۔ توحید انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، کٹیہار میں مولانا آزاد کے یوم پیدائش کے موقع پر ''مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت'' کے عنوان سے ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی جناب ذاکر حسین سابق چیئرمین ضلع پریشد تھے۔ سیمینار کے آغاز میں جناب افتخار عالم، سنٹر انچارج نے شمع روشن کی۔ طالب علم ابوطاہر نے نعت رسولؐ سے تمام شرکا کو محظوظ کیا۔ مقررین میں ڈاکٹر انور ایرج، جناب سنتوش کمار جھا، سید اماذالدین قادری، مہدی حسن غزالی، جے پرکاش شرما، سنٹر انچارج افتخار عالم، سنٹر سپروائزر مہتاب احمد اور گیا نیشور مشر پرامرشی نے اپنے خیالات ظاہر کیے۔ محترمہ عشرت پروین نے مولانا کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی اور اس پر زور دیا کہ ان کی تعلیمات کی روشنی میں ٹھوس عملی اقدام کا اہتمام کیا جائے۔
(ڈاک سے)

● گلبرگہ۔ جناب رشید سگری لکچرار کی اطلاع کے بموجب حلیمہ کمپیوٹر سنٹر میں زیر اہتمام حلیمہ ادبی و ثقافتی مرکز کی جانب سے ''یوم تعلیم'' کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقع پر کمپیوٹر سنٹر کے طلبہ و طالبات کے تحریری و تقریری مقابلے منعقد ہوئے جس میں طلبہ و طالبات نے مولانا ابوالکلام آزاد کی عبقری شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج ہمیں ایسی ہی شخصیتوں کی ضرورت ہے جس سے نوجوان نسل میں مذہب اور تعلیم کا نہ صرف احساس پیدا ہو بلکہ حصول علم کے لیے شعور بھی اجاگر ہو۔

تقریری مقابلے کے مہمان خصوصی جناب محب کوثر تھے اور صدارت جناب امجد جاوید نے فرمائی۔ اس تقریری مقابلے میں محترمہ شہزادی فرحت (اوّل)، محترمہ زیب النسا (دوم)، محترمہ حنا کوثر (سوم) اور محترمہ محمدی بیگم (ترغیبی انعام) کو انعامات پیش کیے گئے۔ (ڈاک سے)

● گورکھپور۔ علامہ اقبال، مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لعل جیسی قد آور شخصیتیں جن کی مادری زبان اردو تھی، اتفاق سے تینوں کی پیدائش کا مہینہ نومبر ہی ہے۔ اردو کا گہوارہ ہندوستانی قومی یکجہتی نیز ملک کی ترقی میں اس کا اہم کردار رہا ہے اور ہے لیکن اردو کے تعلق سے خود اردو والے مخلص نہیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم عملی اقدام کریں۔ دیکھا جارہا ہے کہ سفر میں بس اور ریلوے اسٹیشنوں پر سے اردو اخبارات اور رسائل غائب ہوتے جارہے ہیں، اردو داں حضرات کو اس کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔ قاضی عدیل عباسی کے طریقۂ کار کو ہم اردو کے فروغ کے لیے مشعل راہ بناسکتے ہیں۔ اردو دشمنی ختم کرنے کے لیے افہام و تفہیم کی ضرورت ہے تا کہ غلط فہمیاں دور ہوں۔ اردو کسی زبان کی دشمن نہیں ہے بلکہ اردو نے ہندوستانی زبانوں کو متمول ہی کیا ہے۔ یہ بات برادران وطن کو تواتر کے ساتھ اور مثبت انداز میں بتانے کی ضرورت ہے۔

مذکورہ باتیں ''فروغ اردو کیوں اور کیسے'' کے تعلق سے ماہانہ ادبی نشست میں پیش کی گئیں۔ اس بار اسے ''یوم اردو'' سے منسوب کرتے ہوئے خصوصی گفتگو کا اہتمام ناصر لائبریری گورکھپور میں کیا گیا تھا جس میں اظہار خیال کرنے والوں میں پروفیسر احمر لاری، دھیان سنگھ نیپالی، سید نورالحسن، محمد افراہیم، علیم عالمی، شمس الحسن لاری، تنویر احمد اور انور کمال قابل ذکر ہیں۔
(ڈاک سے)

● اودے پور۔ 24 ستمبر، گورنمنٹ میرا گرلس کالج کے شعبۂ اردو میں ڈاکٹر غضنفر کے توسیعی لکچر کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر صدر ''بزم ادب'' شگفتہ ناز نے ''غضنفر کی ناول نگاری'' اور طالبہ مصطفیٰ بیگم نے ''افسانہ نگاری'' پر مقالے پڑھے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر ریکھا شری مالی، پرنسپل کالج اور مہمان اعزازی ڈاکٹر

ایس.ایس. چوہان تھے۔ ڈاکٹر قمرالدین نے غضنفر کا تعارف پیش کیا۔

ڈاکٹر غضنفر نے ''اردو شاعری کی غرض و غایت اور اس کی تدریس'' پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے لکچر کے بعد ایک گھنٹہ سوالات کا سلسلہ چلا۔ شعبۂ اردو کی طالبات نے سوالات کی جھڑی لگادی۔ ڈاکٹر غضنفر ہر سوال کے معیاری ہونے پر تعجب بھی کرتے جاتے تھے اور جواب بھی دیتے جاتے تھے۔ طالبات کی فرمائش پر انھوں نے اپنی غزلیں بھی سنائیں۔

شکریے کی رسم طالبہ عرفانہ بانو نے ادا کی۔ اگلے دن 25 ستمبر 2007 کو ادبی سنگم کے آفس 74 او. ٹی. سی. اسکیم میں غضنفر کے اعزاز میں ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں خلیل تنویر، شاہد عزیز، اقبال ساگر، زہرہ خان، شگفتہ سروپیہ، ثروت خان، خورشید نواب، مشتاق چنچل، بشریٰ خاتون اور احسان خاں نے شرکت کی۔ غضنفر نے اپنا افسانہ ''اسپیس مین'' اور ثروت خان نے افسانہ ''انکشاف'' سنایا۔ دیگر حضرات نے اپنے شعری کلام سے محظوظ کیا۔

(ڈاک سے)

● کھنڈوہ۔ ماہنامہ ''کوہسار'' بھاگلپور کے مدیر، مصنف، مرتب اور مؤلف پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی دو تازہ ترین کتابوں ''ماں'' اور ''اے ماں'' کے اجرا کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ کھنڈوہ کے زیر اہتمام جواہر ہائی اسکول کھنڈوہ میں ایک مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ صدارت کہنہ مشق شاعر قاضی حسن رضا نے کی جبکہ ڈاکٹر محبوب راہی بحیثیت مہمان خصوصی شریک رہے۔ نظامت کے فرائض پرنسپل حبیب عالم نے انجام دیے۔ رسم گلپوشی کے بعد ڈاکٹر محبوب راہی نے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی ہمہ جہت ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے مختلف اصناف شعروادب پر ان کی کتابوں کا ذکر کیا۔ ''ماں'' اور ''اے ماں'' کا اجرا بالترتیب قاضی حسن رضا اور ڈاکٹر محبوب راہی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ان دونوں کتابوں میں ''ماں'' موضوع کے تحت دنیا بھر کے اردو شعرا کی شعری تخلیقات کو یکجا کر کے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اجرائی تقریب کے جناب قاضی حسن رضا، مناظر عاشق ہرگانوی، مہمان خصوصی ڈاکٹر محبوب راہی کے علاوہ حمید السعید دلکش کھنڈوہی، منشی جلیس، شیخ عبداللہ شیخ، سفیان قاضی، گوہر انصاری، حبیب عالم، اقبال احمد اقبال، گووند گپتے واحد، منشی خاں آزاد، ستار کھنڈوہی، قاضی طلحہ حسین، سلمان خاں، ڈاکٹر عاصم غلام غدری، نواب ملک، عبدالرشید لالہ اور نعمان قاضی نے اپنے منتخب کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ (ڈاک سے)

● چھتیس گڑھ حکومت کی جانب سے اس سال اردو کے لیے حاجی حسن علی اردو ایوارڈ اردو شاعر علی سجاد رسوا ایرانی کو دیا گیا جو ایک لاکھ روپئے نقد تمغہ اور سند و سمان پر مشتمل ہے۔ چھتیس گڑھ راجیہ اتسو پر یہ انعام جناب لال کرشن اڈوانی کے ہاتھوں دیا گیا۔ اس موقعے پر وزیر اعلیٰ ڈاکٹر رمن سنگھ، راجیہ پال جناب ای.ایس. ایل. نرسمہم بھی موجود تھے۔ علی سجاد رسوا ایرانی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بحیثیت شاعر ہر دل عزیز شخصیت کے مالک ہیں۔ اڑتیس برسوں سے اردو ادب کی خدمت کرتے آرہے ہیں آپ چشمے بنانے کا کام کرتے ہیں اور فٹ پاتھ پر ان کی دکان ہے۔ آپ رائے پور سے تعلق رکھتے ہیں۔

چھتیس گڑھ راجیہ اتسو میں مشہور غزل سرا طلعت عزیز غزل گائیکی کا پروگرام ہوا قریب 20 ہزار سامعین نے لطف اٹھایا۔ اردو غزلوں سے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ (ڈاک سے)

● پورنیہ۔ 27 نومبر، شہر میں علمی و ادبی سرگرمیوں اور اردو زبان و ادب کی خدمات کے لیے متحرک تنظیم ''اردو رابطہ کمیٹی'' کے نمائندوں کا ساتواں اجلاس گذشتہ روز بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف لائے پروفیسر طارق جمیلی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے بجھتے چراغ کو نئی نسل کی ضرورت ہے۔ اردو ہماری تہذیب و تمدن کا ورثہ ہے اور ہمارا لسانی وثقافتی اور علمی و ادبی سرمایہ ہے۔ اس کی حفاظت کرنا اور اس کو پروان چڑھانے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ پروگرام میں کامیاب طلبہ کو انعامات سے نوازا گیا۔ پروفیسر اصغر عالم نے کمیٹی کی سال بھر کی کارکردگی پر تفصیلی روشنی ڈالی اور نئی کتابوں، مجلوں اور اخبارات و رسائل سے متعلق اطمینان کا اظہار کیا۔ کمیٹی کے سرپرست ڈاکٹر م.ش. اطہر حسین کی اردو خدمات کا اعتراف کیا گیا جن کی کوششوں سے رابطہ کے بینر تلے علمی مقابلے، ہومیو کوچنگ، مفت دوا اور دیگر پروگرام منعقد ہوتے ہیں۔ آخر میں اجلاس کے ناظم مولانا منظور نعمانی نے شرکائے اجلاس کا شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● گیا۔ 27 نومبر، اردو کے لیے اگر مجھے لاٹھیاں بھی کھانی پڑیں یا جیل بھی جانا پڑے تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ میری زندگی اردو کے لیے ہی ہے اور خاتمہ بھی اردو کے فروغ کے لیے ہی ہوگا۔ اردو کا جو نقصان ہوا ہے اس کے ذمے دار ہم خود ہی ہیں۔ اردو کو اگر زندہ رکھنا ہے تو اسے اپنے گھروں میں بچوں کے درمیان عام بول چال کی زبان میں استعمال کرکے اپنی ذمے داری کا احساس دلانا ہوگا۔ اس کے علاوہ گھر میں اردو کے چلن کے لیے کم از کم اردو کا ایک اخبار، ایک رسالہ ضرور منگوانا ہوگا تاکہ بچے اپنی زبان اور اپنی تہذیب سے مکمل طور پر آشنا اور ہم آہنگ ہوسکیں۔ مذکورہ باتیں آج سابق وزیر و اردو کونسل ہند کے صدر شکیل نبی نے گیا کے سرکٹ ہاؤس میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو عوام کی زبان ہے، یہ عام لوگوں کی زبان ہے، اردو سے ہماری تہذیب وابستہ ہے اس لیے اس پر سبھوں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ شکیل نبی نے کہا کہ اردو کو قومی سطح پر دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے کے لیے

اردو بیداری مہم چلائی جارہی ہے جس کے تحت 15 دسمبر کو انجمن اسلامیہ ہال، پٹنہ میں اردو بیداری کانفرنس کا انعقاد کیا گیا ہے جس میں سرکار دو ماہ کا وقت اردو کے فروغ کے سلسلے میں کارروائی کرنے کے لیے دیا جائے گا۔ اس میٹنگ میں اردو کو کل ہند پیمانے پر دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے، سارے اضلاع میں اس کا نفاذ کرنے اور اردو اڈوائزری بورڈ کی تشکیل کرنے کے لیے سرکار سے مانگ کی جائے گی اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو پورے ہندوستان میں اس کے خلاف تحریک چلائی جائے گی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● سردھنہ۔ 7 دسمبر، سماجی، ادبی و فلاحی تنظیم ''افکار'' کے زیر اہتمام ''ارتقائے اردو کی کوششیں اور حقیقت'' کے عنوان سے یہاں ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں جہاں کچھ مقررین نے اردو زبان کی موجودہ حالت پر افسوس و مایوسی کا اظہار کیا وہیں کئی مقررین نے مایوسی کے بھنور سے نکل کر عملی جدوجہد پر زور دیا۔ مائناریٹی اسکولس ویلفیئر ایسوسی ایشن کے ریاستی صدر جناب رفعت عالم نے کہا کہ اردو کے معاملے میں سرکار کی نیت صاف نہیں ہے۔ سرکاری اعلانات میں شوروغوغا کے سوا کچھ نہیں اس لیے اردو حلقوں کو اس سمت میں ازخود پیش قدمی کرنی ہوگی۔ نوجوان شاعر فرقان سردھنوی نے کہا کہ فروغ اردو کے سلسلے میں بہت سی مشکلات درپیش ہیں جن پر اردو آبادی مخلصانہ جدوجہد سے قابو پاسکتی ہے۔ صلاح الدین ادریسی نے اردو زبان کی آبیاری میں مدارس اسلامیہ اور شعری نشستوں کے انعقاد کو سراہا۔ عمران الزماں صدیقی نے کہا کہ اردو آبادی کو پہلے اپنی مادری زبان سے جذباتی رشتے کو استوار کرتے ہوئے اسے عملاً تحریری اور تقریری طور پر اختیار کرنا ہوگا۔ مذاکرے میں اسرار حسین رضوی، قاضی غیور حسن، عائشہ پروین، عارف علی ایڈووکیٹ اور عبدالسلام فریدی نے بھی حصہ لیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● دیوبند۔ 20 نومبر، اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے صدر جناب راؤ عبدالستار نے کہا کہ مدارس اردو کے محافظ ہیں۔ اردو اساتذہ کو چاہیے کہ وہ سرکاری اسکولوں میں اگر اردو نہیں پڑھا پارہے ہیں تو اپنے روزمرہ کے کاموں میں اردو کا استعمال ضرور کریں۔ انھوں نے اردو ٹیچرس کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ ایک بچے کو اردو پڑھانے کی ذمے داری اپنے اوپر لے کر اسے اردو ضرور پڑھائیں۔ خاص طور پر مسلم نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اردو سے متعلق تمام امتحانات میں حصہ لیں ''اردو کے مسائل اور ان کے حل'' کے عنوان پر منعقدہ اس سیمینار میں ڈاکٹر عثمان الحق صدیقی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ ڈیڑھ سو سالوں میں دیوبندی عالموں، ادیبوں، صحافیوں اور شعرائے کرام نے اردو کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے بھی چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ عربی کے بعد مذہب اسلام کی سب سے زیادہ کتابیں اردو زبان میں ہیں اور یہ سب دیوبند کی بدولت ہیں۔ توصیف احمد قریشی نے کہا کہ صوبائی حکومت کے تعاون کے بغیر اردو کی ترقی گذشتہ آدھی صدی سے رکی ہوئی ہے۔ پروگرام کی صدارت محمد احمد اور نظامت سید وجاہت شاہ نے کی۔ اس موقع پر اردو کے تحفظ کے سلسلے میں ہارون انصاری، ماسٹر خورشید احمد صدیقی، نیرالاسلام قریشی، محمد صابر، امیر حسن اور اسعد صدیقی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 4 نومبر، غالب اکیڈمی نئی دہلی میں گذشتہ روز ایک ماہانہ ادبی جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں اردو کے مشہور افسانہ اور ناول نگار، اردو ریسرچ اینڈ ٹریننگ سینٹر لکھنؤ کے پرنسپل غضنفر علی نے اپنا نیا افسانہ ''تصویر تخت سلیمانی'' پیش کیا۔ ڈاکٹر مولا بخش نے اس افسانے پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس کی کئی جہتیں ہیں اور یہ ایک اہم اور منفرد افسانہ ہے۔ افسانے پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے پیغام آفاقی نے کہا کہ یہ افسانہ توجہ چاہتا ہے، اس پر ٹھہر ٹھہر کر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک بار میں یہ افسانہ پوری طرح نہیں کھلتا۔ انجم عثمانی نے اس افسانے کو بہت پسند کیا اور کہا کہ افسانے کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ فرحت احساس نے کہا کہ غضنفر اس افسانے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ اس جلسے کی صدارت کمال جعفری نے کی اور نسیم عباسی، اسد رضا، نگار عظیم، ظہیر برنی، فرحت احساس، مظہر الحق مخدومی، طالب زیدی اور متین امروہوی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● اردو کونسل پمپری چنچورکی جانب سے علامہ اقبال کی پیدائش کے موقع پر 9 نومبر کو اردو کی حقیقی ترقی کے لیے نمایاں خدمات انجام دینے کے اعتراف میں پروفیسر این بال کرشنن، چیئرمین انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس، جناب مبارک کاپڑی، جناب ادھے بنسالکر، ڈاکٹر انور شیخ، سنجے مانے، محترم پرساد کالے، آئی. ایس. او، محترمہ شبانہ شیخ محترمہ رشیدہ خان، محترمہ منیرہ قادری، مبارک شیخ، لہو کامبلے اور رخسانہ شیخ، کو ''نشانِ اردو ایوارڈ'' کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ''نشانِ اردو ایوارڈ'' ایک سپاس نامہ، ایک مومنٹو، شال، اور ایک کتاب پر مشتمل ہوگا۔ ''نشانِ اردو ایوارڈ'' سے اردو زبان کی ترویج و ترقی میں نمایاں خدمات ادا کرنے والوں کے لیے ایک نئے باب کا آغاز ہورہا ہے جو ہر اعتبار سے مبارک ہے۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

● شملہ۔ 29 نومبر، بھاشا وسنسکرتی و بھاگ ہماچل پردیش کے زیر اہتمام ایک مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت پرنسپل سکریٹری جناب اشوک ٹھاکر IAS نے فرمائی۔ بھاشا وبھاگ کے ڈائرکٹر جناب پریم کمار

مشرا نے اپنے محکمے کے ذریعے اردو کی ترویج و توسیع کے پروگراموں پر روشنی ڈالی۔ مشاعرے کی نظامت بزرگ شاعر جناب شباب للت نے فرمائی۔ جن شعرا نے اس مشاعرے میں شرکت کی ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں جناب شاہد ماہلی، پروفیسر صادق (دہلی)، اقبال مرزا (لندن)، محترمہ آشا شیلی (ستار گنج)، روپا صبا (چنڈی گڑھ)، کرشن کمار طور (دھرم شالہ)، دید دیوانہ، شمس تبریزی، پورن احسان، رانا گنوری اور راشد جمال فاروقی (رشی کیش)۔ شملہ کے مشہور ہوٹل پیٹر ہوف (Peter Hoff) میں یہ مشاعرہ شام 5 بجے سے رات کے ساڑھے نو بجے تک جاری رہا۔ شعرائے کرام کو ہماچلی ٹوپیاں پیش کی گئیں۔ (ڈاک سے)

● رام پور۔ 18 نومبر، رام پور کے آخری نواب رضا علی خاں کی 101 ویں سالگرہ پر منعقد ہند و پاک مشاعرے کی صدارت ہاتھرس کے ایڈیشنل سیشن جج بدرالدجیٰ نقوی نے اور نظامت رئیس انصاری نے کی۔ اس موقع پر رضا لائبریری کے او.ایس.ڈی. ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی نے بتایا کہ ریاست کے آخری نواب رضا علی خاں روشن خیال، ادب پرور، حکمراں تھے۔ ایک طرف انھوں نے تعلیم کو فروغ دینے کے لیے بڑی تعداد میں تعلیمی ادارے قائم کیے تو دوسری طرف رام پور کے لوگوں کو روزگار مہیا کرانے کے لیے 27 فیکٹریاں قائم کیں۔ ان کے علاوہ بہترین ادبی خزانہ ''رضا لائبریری'' کو بھی قوم کے نام وقف کر دیا۔ انھوں نے ہند و پاک مشاعرے کے لیے مرکزی وزیر سیاحت امبیکا سونی اور اتر پردیش کے گورنر ٹی راجیشور راؤ کا شکریہ ادا کیا۔ جن شعرا کا کلام پسند کیا گیا ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: اظہر عنایتی، آذر نعمانی، نزہت انجم، آر کے ماتھر، ڈاکٹر جاوید نسیمی، ظہیر رحمتی، شہزادہ گلریز، آفتاب شمسی، افضل منگلوری، حسیب سوز، چرن سنگھ بشر، انا دہلوی، ساغر خیامی، رئیس انصاری، ماجد دیوبندی، ہوش نعمانی، معراج فیض آبادی، وسیم بریلوی، وقار صدیقی، رفعت سروش، بیکل اتساہی، شہریار، احمد فراز، نوید قیصر، سعید راہش اور مخمور سعیدی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● سہارنپور۔ 9 دسمبر، معروف شاعر اخلاق حسین واصف عابدی اور ادب نواز شخصیت سید مطلوب کی یاد میں اردو مرکز کے زیراہتمام اسکول گلشن تعلیم میں پروقار مشاعرے کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت کہنہ مشق شاعر اکمل امام نے اور نظامت احسن وارثی نے کی۔ ڈاکٹر ارشاد ساگر نے شمع روشن کی۔ خواجہ سلطان انجم کی سرپرستی میں مشاعرے کا آغاز ہوا۔ اس موقع پر گلشن تعلیم کے منیجر حاجی ظہور احمد متولی اور خواجہ سلطان انجم کو واصف عابدی ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ شاہد زبیری نے واصف عابدی کے فن اور شخصیت کا اجمالی خاکہ پیش کیا۔ اس مشاعرے میں درج ذیل شعرا نے شرکت کی: اکمل امام، خواجہ سلطان انجم، پیکر یزدانی، صابر فریدی، صغیر ساغر، ڈاکٹر ارشاد ساگر، احسان وارثی، فیاض ندیم، مستقیم روشن، خرم سلطان، سید راشد، طالب عرفانی، طاہر امین، رضوان سہارنپوری، شاکر نظر، شاہ فیصل، سدھیر پرواز اور سلیم احمد سلیم۔ ان کے علاوہ ناصر زیدی، محمود اثر، سالم سہارنپوری، عاصم پیرزادہ اور حکم چند پیٹرت نے بھی سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● علی گڑھ۔ 14 نومبر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اجمل خاں طبیہ کالج کے شعبۂ کلیات کے زیراہتمام منعقد سہ روزہ انٹرنیشنل کانفرنس برائے ''ہولسٹک اپروچ آف یونانی میڈیسن ان لائف اسٹائل ڈزیز'' کے موقع پر آزر اکیڈمی کی جانب سے کینیڈی ہال آڈیٹوریم میں ایک عالمی مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن علی گڑھ کے ریسرچ آفیسر اور بزرگ شاعر ڈاکٹر سید تاجدار حسین زیدی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ممتاز شاعر اویس جمال شمسی نے انجام دیے۔ اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی ملیشیا کے ڈاکٹر حنفی محمد نور نے مہمان خصوصی، بنگلہ دیش کے ڈاکٹر شارق ایچ خاں نے مہمان ذی وقار اور ڈاکٹر معظم خاں نے اعزازی مہمان کی حیثیت سے مشاعرے کو وقار بخشا۔ جنوبی افریقہ سے آئے پروفیسر راشد بھیکا، انگلینڈ سے آئے پروفیسر سعید گل اور جمیل مظہر سیانوی نے مشترکہ طور پر مشاعرے کی شمع روشن کر کے پروگرام کا افتتاح کیا۔ حاضرین کا خیر مقدم پروفیسر انیس احمد انصاری نے کیا اور سید مشرف حسین محضر نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر شعبۂ کلیات کی جانب سے مہمان شعرا اور ناظم مشاعرہ کو یادگاری نشانات پیش کیے گئے۔ جن شعرا کا کلام پسند کیا گیا ان کے نام اس طرح ہیں: ڈاکٹر سید تاجدار حسین زیدی، ڈاکٹر معظم علی خاں، جمیل مظہر سیانوی، ڈاکٹر طاہر رزاقی، راحت حسن، حکیم اشہر قدیر، اویس جمال شمسی، ندیم برنی، مشرف حسین محضر، شاعر الجمیل، محمد حنیف آرزو، ڈاکٹر راشد الاسلام، محمد عمر کاوش، مبشر قمر، جانی فاسٹر، بصیر الحسن وفا، کے. این. پانڈے، مجیب شہزر، دانش مارہروی، ارشد منصور غازی، استاد شفیق بیگ، ادریس نشاط، بابر الیاس اور ہریش بیتاب۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● حیدرآباد۔ 15 نومبر، شہر حیدرآباد کے قدیم شعرا اور اساتذۂ سخن کی اہمیت کو تمام ادبی حلقوں نے تسلیم کیا ہے۔ جن شاعروں نے اپنی بھرپور شاعرانہ زندگی کا ثبوت دیا ہے ان میں ایک اہم نام طالب رزاقی کا ہے۔ بزم طالب رزاقی کے زیراہتمام 10 نومبر کی شام کو اردو گھر مغل پورہ میں زیر صدارت صدرنشین اردو اکیڈمی رحیم الدین انصاری، طالب رزاقی کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں نہایت کامیاب ادبی اجلاس و مشاعرہ ہوا۔ مہمانان

خصوصی صلاح الدین نیر مدیر ''خوشبو کا سفر'' شاغل ادیب اور ڈاکٹر بشیر احمد تھے۔ داعی معتمد بزم طالب رزاقی نے خیر مقدم کیا۔ مشاعرے کی صدارت اثر غوری نے کی۔ جناب صلاح الدین نیر، اثر غوری، فیض الحسن خیال، شاغل ادیب، سلیم عابدی، حلیم بابر، عابدی، جلال عارف، یوسف الدین یوسف، بصیر افضل صدیقی، یوسف روش، ناقد رزاقی، کبیر آفاقی کے علاوہ قیام الدین انصاری، عبدالعزیز حسین وغیرہ نے کلام سنایا۔ صدر اجلاس رحیم الدین انصاری نے کہا کہ طالب رزاقی اپنے دور کے ایک کامیاب اور بہترین غزل گو شاعر تھے بلکہ بہت عمدہ نعتیں بھی سناتے تھے۔ میں نے کئی مشاعروں میں انھیں کلام سناتے ہوئے دیکھا ہے۔ صلاح الدین نیر نے کہا کہ طالب رزاقی کے ساتھ میں نے بیسوں مشاعرے پڑھے ہیں، ان کی شاعری کلاسیکی ہے اور وہ ترنم میں شعر سناتے تھے۔ یہ مشاعرے میں ان کی شرکت، مشاعرے کی کامیابی میں معاون ثابت ہوتی تھی۔ طالب رزاقی کے کئی شاگرد تھے جن میں کلیم قریشی، نادر اسلوبی اور جوہر ہاشمی قابل ذکر ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے اساتذہ کی یاد میں ادبی محفلوں کا اہتمام کرتے رہیں۔ شاغل ادیب نے طالب رزاقی کے فکر وفن کا تفصیلی جائزہ لیا اور کہا کہ طالب رزاقی کی شاعری استادانہ شاعری ہے۔ انھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ ان کا کلام فنی خوبیوں سے مالا مال تھا۔ ڈاکٹر سید بشیر احمد نے طالب رزاقی کی حیات اور شاعری پر روشنی ڈالی اور کہا کہ طالب رزاقی کی شاعری غزلیہ شاعری کی بہترین مثال ہے۔ اس ادبی مشاعرے میں ادب دوست حضرات کی خاصی تعداد نے شرکت کی۔

(منصف، حیدرآباد)

● کھنڈوہ۔ معروف کہنہ مشق شاعر، نیشنل ایوارڈ یافتہ پرنسپل قاضی حسن رضا کے علمی، ادبی اور تعلیمی کارناموں پر محیط ماہنامہ ''آفاق'' پونہ نے ''گوشۂ قاضی حسن رضا'' شائع کیا ہے جس کے اجرا کے سلسلے میں شہر کھنڈوہ میں ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ صدارت کے فرائض محمد رفیق رفا سیٹھ نے انجام دیے جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے میئر کھنڈوہ جناب ویر سنگھ ہنڈون کی شرکت رہی۔ شری ابھا بھ کی زیر سرپرستی مشاعرے میں مدیر ''اسباق'' نذیر فتح پوری کو ان کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر ممتاز احمد خوشتر ایوارڈ، میئر کھنڈوہ کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔ پروفیسر مظفر حنفی کو بھی میئر کھنڈوہ کے ہاتھوں ''وقار ادب'' ایوارڈ دیا گیا۔ ڈاکٹر گنیش گائیکواڑ کو ہندو مسلم ایکتا ایوارڈ، ڈاکٹر منیش مشرا کے ہاتھوں دینے کے بعد پرنسپل حبیب عالم کو ''اسباق'' ادبی ایوارڈ، مظفر حنفی صاحب کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔ ''اسباق'' کا اجرا ڈاکٹر محبوب راہی کے ہاتھوں انجام پذیر ہوا۔ مشاعرے کا آغاز اختر گوالیاری کی نعت پاک سے ہوا۔ جن شعرا نے اپنا کلام سنایا ان میں پروفیسر مظفر حنفی، ڈاکٹر محبوب راہی، انجم رہبر، اختر گوالیاری، ڈاکٹر ضیا ٹونکی، نذیر فتح پوری، ڈاکٹر مہتاب عالم، تنویر غازی، ڈاکٹر یونس فرحت، مہیندر راشک، ڈاکٹر دیویندر کافر، ڈاکٹر گنیش گائیکواڑ، متان فراز، ڈاکٹر امین انعامدار، احمد نثار، گھنشام اگروال، نعیم اختر کارپوریٹر، عالم فتح پوری، اسحٰق اثر، شعور کرشنا، پریتی باجپائی اور نعیم فراز کے علاوہ مقامی شعرا میں صاحب اعزاز، قاضی حسن رضا، ڈاکٹر صفدر رضا، کے منشی جلسی، دلکش کھنڈوہی، شیخ عبداللہ شیخ، گوہر انصاری، اقبال گرامی، سفیان قاضی اور گووند گیتے واحد کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

(ڈاک سے)

رسمِ اجرا

''اردو صحافت کا سفر''

● نئی دہلی۔ بزرگ صحافی گربچن داس چندن کی تازہ کتاب ''اردو صحافت کا سفر'' کا اجرا ایک علمی اور صحافتی مجلس میں مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات پریہ رنجن داس منشی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقع پر مقررین نے زور دے کر کہا کہ اردو کے ساتھ ہو رہی حق تلفی کا ازالہ ہونا چاہیے جس کے بغیر تحریک آزادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ آج پہلی جنگِ آزادی (1857) کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات منائی جارہی ہیں لیکن ان میں نہ تو اردو صحافت کا کوئی تذکرہ ہے اور نہ ہی جد و جہد آزادی میں اپنی جان نچھاور کرنے والے اولین صحافی مولوی محمد باقر کا۔ کسی اور زبان کی صحافت اس اعزاز کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

اپنی تقریر میں پریہ رنجن داس منشی نے اس امر کا اعتراف کیا کہ اردو اور اس کی صحافت نے تحریک آزادی میں جو رول ادا کیا اسے کسی بھی طرح سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وزیر موصوف نے کہا کہ اردو کی دل پذیری اور دل نشینی اس قدر ہے کہ نہ سمجھنے والا بھی اسے سننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو کسی ایک فرقے یا مذہب سے منسوب کرنا، اردو زبان کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ چندن صاحب نے اس پیرانہ سالی میں اردو صحافت کی تاریخ مرتب کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کے لیے وہ ہم سب کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

محترمہ منورما دیوان نے کہا کہ اردو کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسے اس کا جائز حق نہیں دیا گیا۔ اردو صحافت کے بغیر تحریک آزادی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان کی صحافت سے قبل کسی اور ہندوستانی زبان کی صحافت کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ آزادی کا سارا کا سارا لٹریچر صرف اور صرف اردو میں تھا۔

انھوں نے بتایا کہ بھگت سنگھ نے "بھارت یوا سبھا" کے نام سے جو تنظیم بنائی تھی اس کا سارا لٹریچر اردو میں تھا۔ انھوں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ اردو کو ایک خاص فرقے سے وابستہ کرکے اس کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہے۔ یہاں فلموں کے مکالموں سے لے کر نغمے سب اردو میں ہوتے ہیں لیکن اس کا کریڈٹ کسی اور زبان کو دیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ راگ الاپا جاتا ہے کہ اردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو نام ہیں جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اردو ایک مکمل زبان اور تہذیب کا نام ہے جس کا کوئی زبان مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ٹی وی چینل ہوں یا ٹی وی سیریلس، سب کی زبان اردو ہوتی ہے مگر اسے ہندی کہا جاتا ہے۔ دنیا میں کسی زبان کے ساتھ اس سے بڑی بددیانتی اور کیا ہوسکتی ہے۔ محترمہ دیوان نے کہا کہ وہ اردو صحافت کی بیٹی ہیں اور ان کے والد پرنسپل چھبیل داس لالہ لاجپت رائے کے اخبار "وندے ماترم" کے مدیر رہے اور ان کی ماں سیتا دیوی نے جتنی بھی کتابیں لکھیں وہ سب اردو میں ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ جو لوگ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیتے ہیں جی. ڈی. چندن جیسے افراد ان کا جواب ہیں۔ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا گو مذہب کو زبان کی ضرورت ہوتی ہے لیکن زبان کا کردار ہمیشہ سیکولر ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس حوالے سے انگریزوں نے نفرت کا جو بیج بویا تھا اسے آج دور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ چندن صاحب کی کتاب کا انگریزی اور ہندی ایڈیشن شائع کرنے کا مشورہ پریس انفارمیشن بیورو کو دیتے ہوئے پروفیسر واسع نے کہا کہ اس سے ہندی والوں کو قریب لانے میں اور اردو کے کردار سے نئی نسل کو آشنا کرنے میں مدد ملے گی۔

اس سے قبل ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "اردو صحافت کا سفر" پر خیال آرائی کرتے ہوئے کہا کہ چندن صاحب اردو صحافت کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا ہیں اور انھوں نے اس کتاب میں بعض ایسے گوشوں کو اجاگر کیا ہے جن کی طرف ابھی تک کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی تھی۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے مشہور اخبار "الہلال" کو بند کروانے میں الہٰ آباد سے شائع ہونے والے اخبار "پائنیر" کا ہاتھ تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب عالمانہ اور ناقدانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ اس سے قبل مولانا امداد صابری مرحوم اور محمد عتیق صدیقی مرحوم کی اردو صحافت پر لکھی ہوئی کتابیں گو معلومات کا خزینہ ہیں لیکن ان میں نقد و نظر کا فقدان ہے۔ پروفیسر عبدالسلام خورشید کی کتاب پاکستانی نقطۂ نظر پر مبنی ہے۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ اردو آج بھی جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی زبان ہے اور اگر ہندی کو اپنی مقبولیت میں اضافہ کرنا ہے تو اسے اردو کی شیرینی سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کی طرف سے چندن صاحب کو سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ "چندن صاحب کی کتاب اردو صحافت کی تاریخ اور تفہیم میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ چندن صاحب اس سے قبل "اردو صحافت پر ایک نظر" (1986) اور "جام جہاں نما" (1992) کے علاوہ کئی اور کتابیں قلم بند کرچکے ہیں۔ ان کی یہ نئی کتاب اردو کی قلمی صحافت سے لے کر آج تک کی صحافت کا احاطہ کرتی ہے۔

اپنی صدارتی تقریر میں مرکزی وزیر توانائی اور سابق وزیر اعلیٰ مہاراشٹر سوشیل کمار شنڈے نے کہا کہ چندن صاحب کی یہ کتاب ہم سب کے لیے مشعل راہ ہے اور نئی نسل کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انھوں نے اردو کو ایک بہت ہی فصیح و بلیغ زبان قرار دیتے ہوئے کہا کہ اسے کسی ایک فرقے سے وابستہ کرنا غلط ہے۔ وزیر موصوف نے اس موقع پر یو پی اے حکومت کی طرف سے اردو کے فروغ کے لیے جاری کاوشوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو سمیت تمام ہندوستانی زبانوں کے فروغ کے لیے ہم سب کو مل کر کام کرنا چاہیے۔

پریس انفارمیشن بیورو کے ہال میں منعقدہ رونمائی کی اس تقریب میں متعدد سرکردہ صحافیوں کے علاوہ مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی شخصیات کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اس کا اہتمام آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس نے کیا تھا۔ (ڈاک سے)

"جہانِ رقص و نغمہ"

● نئی دہلی۔ 4 دسمبر، رفعت سروش اردو میں ڈانس ڈراما کے موجد ہیں، انھیں ہمہ جہت فنکار کا درجہ حاصل ہے، ان کے ڈراموں میں ہماری تاریخ اور تہذیب موجود ہے اور انھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے، ان خیالات کا اظہار ساہتیہ اکادمی میں واقع رابندر بھون میں معروف ادیب اور مصنف رفعت سروش کے اوپیرا اور منظوم ڈراموں پر مشتمل مجموعہ "جہان رقص و نغمہ" کی تقریب رونمائی کے موقع پر مقررین نے کیا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر شاہد مہدی اور نظامت معروف شاعر مخمور سعیدی نے کی۔ کتاب کا اجرا ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیا۔

گوپی چند نارنگ نے کہا کہ رفعت سروش کی اب تک 50 سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ منظوم ڈراموں میں ان کا اپنا مقام ہے۔ منظوم ڈراما لکھنا آسان ہے لیکن اوپیرا کی شرائط کو نبھانا بہت مشکل ہے، رفعت سروش نے اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔ انھوں نے ان کے منظوم ڈرامے "جہاں آرا" کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اردو میں تھیٹر کا

زوال ہو چکا ہے جسے ایک بار پھر زندہ کیے جانے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ رفعت سروش ہمارے زمانے میں تخلیقی اعتبار سے سب سے زیادہ سرگرم شخصیت ہیں۔ اس زمانے میں جو بھی تبدیلیاں آئی ہیں ان کو انھوں نے تخلیقی چیلنج کے طور پر قبول کیا۔ ہم نے اسٹیج کا استعمال صرف مشاعرے کے لیے کیا اب اردو والوں کو چاہیے کہ وہ منظوم ڈراموں اور اوپیرا کو ایک بار پھر اپنے اسٹیج پر لائیں۔ پروفیسر طاہر محمود نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ رفعت سروش کی نظموں اور غزلوں کی طرح ان کے منظوم ڈراموں میں چٹخارے بھی ہیں اور تاریخ و تہذیب بھی، سبق آموز اشارے بھی ہیں اور آپ بیتی اور جگ بیتی بھی، افسانہ بھی اور حقیقت بھی۔ اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئر مین پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ رفعت سروش کے ڈراموں میں ہماری تاریخ و تہذیب موجود ہے۔ وہ ایک حساس تخلیق کار ہیں۔ بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں لیکن بہترین نثر لکھتے ہیں، یعنی وہ ہمہ جہتی تخلیقی ذہن کے مالک ہیں۔ ان کی تخلیقات میں ایک آفاقیت ہے اور انھوں نے کئی دہائی قبل جو ڈرامے لکھے ان کی کیفیت، لذت اور اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے ان کے منظوم ڈرامے ''جہاں آرا''، ''حبہ خاتون اور پروین رائے'' انھیں خاص طور پر پسند ہیں۔ ڈاکٹر زکی طارق نے کہا کہ منظوم ڈراما نگاری میں وہ سرفہرست ہیں اور اس وقت کوئی ان کا مدمقابل نہیں۔ ان کے ڈراموں کے موضوعات فکر انگیز ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

''ناموں کا انعوا''

● نئی دہلی۔ 4 دسمبر، ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی کی کہانیاں اپنے موضوع، اسلوب، تکنیک، اظہار و بیان اور تاریخی و سماجی شعور کے اعتبار سے خاص نوعیت کی حامل ہیں، ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر خلیق انجم نے یہاں اردو گھر میں ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی کے افسانوں کے مجموعے ''ناموں کا انعوا'' کی رسم رونمائی انجام دیتے ہوئے کیا۔ تقریب رونمائی کا اہتمام دہلی اردو اکادمی اور انجمن ترقی اردو (ہند) نے کیا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے بتایا کہ شکاگو نشیں مظفر الدین 1935 میں آندھرا پردیش کے ضلع میدک میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم تو انھوں نے آندھرا ہی میں حاصل کی، لیکن کیمسٹری میں ایم. ایس. سی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا اور پھر اسی یونیورسٹی سے انھوں نے پی. ایچ. ڈی بھی کیا۔ ڈاکٹر خالد اشرف نے اس موقع پر ایک مقالہ پیش کیا، جس میں انھوں نے کہا کہ مظفر کے افسانوں میں امریکہ میں بسنے والے مہاجرین کے یہاں ایک طرف مغربی اور مشرقی اقدار کے ٹکراؤ کی بازگشت سنائی دیتی ہے تو وہیں دوسری طرف اپنی جڑوں کی طرف مراجعت کا عمل بھی نظر آتا ہے۔ پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے شمالی امریکہ میں اردو کی ترویج و اشاعت میں مظفر الدین فاروقی کی خدمات کا ذکر کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی نے اپنا ایک افسانہ پیش کیا جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ جلسے کے صدر پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ مظفر الدین فاروقی کی کہانیوں میں مشرق و مغرب کا بہت عمدہ امتزاج ملتا ہے۔ مظفر الدین فاروقی ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے قدرداں رہے ہیں۔ چونکہ وہ ایک حساس دل بھی رکھتے ہیں اس لیے اس مشترکہ تہذیب کے زوال اور ٹوٹ پھوٹ سے رنجیدہ و افسردہ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس نے مزید کہا کہ مظفر صاحب کو اردو زبان و ادب اور تہذیب سے غیر معمولی لگاؤ ہے۔ یہ شکاگو میں ادبی اور تہذیبی تقریبات منعقد کرتے رہتے ہیں۔ مرغوب حیدر عابدی نے آخر میں تمام شرکائے جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ڈاکٹر مظفر الدین ادب اور سائنس دونوں کے آدمی ہیں اور ایسی مثالیں اردو ادب میں بہت کم ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

''درد کا رشتہ''

● نئی دہلی۔ 20 نومبر، ''درد کا رشتہ'' کے مطالعے سے انسانی رشتوں کا جو منظر نامہ سامنے آتا ہے اسے دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں ابھی تک وہ دور آیا ہی نہیں کہ ہم انسان سے صرف انسان ہونے کے سبب محبت کرسکیں کیونکہ ہم کسی نہ کسی طرح فاصلے ڈھونڈ لیتے ہیں، ان خیالات کا اظہار آج جامعہ نگر میں انور نزہت کے ناول ''درد کا رشتہ'' کا اجرا کرتے ہوئے معروف فکشن رائٹر رتن سنگھ نے کیا۔ رتن سنگھ نے کہا کہ کہنے کے لیے یہ ایک روایتی ناول ہے مگر اس کے اشارے بہت بلیغ ہیں۔ تقریب کے آغاز میں پروفیسر صغریٰ مہدی نے حاضرین کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ یہ ایک بے تکلف نشست ہے جس میں فنکار کی حوصلہ افزائی اور اس کے فن کے مختلف پہلوؤں پر بغیر کسی لاگ لپیٹ کے لوگ اظہار خیال کریں گے۔ جوگیندر پال نے کہا کہ کسی ناول کا قابل مطالعہ ہونا ہی اس کی کامیابی ہے۔ ڈاکٹر مولا بخش نے کہا کہ ہمارے ناولوں میں بیت بازی اور مضمون نویسی کے مقابلے کے مناظر کمیاب ہیں، انور نزہت نے ان مناظر کو بہت خوبصورتی سے برتا ہے۔ مولا بخش نے کہا کہ یہ ناول ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جسے خود نہیں معلوم کہ اسے کیا بننا ہے مگر ناول کے مرکزی کردار نے ہمیشہ زندگی کی فلاح اور ترقی کے لیے ذاتی رشتوں کو قربان کیا ہے۔ عمیر منظر نے ''درد کا رشتہ'' پر ایک مختصر تحریر پڑھی۔ اس تقریب میں پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر مظفر حنفی، پروفیسر خالد محمود، عظیم اختر، فصیح اکمل قادری، ابرار کرت پوری، ذکیہ ظفر، شمع افروز زیدی، شاہانہ انور، ڈاکٹر عذرا عابدی، ڈاکٹر محمد ارشد، اقبال مہدی، ہما حیدر، رفیع الحسن اور ڈاکٹر مجیب خاں وغیرہ موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

وفیات

پروفیسر محمد شفیع

● علی گڑھ۔ 9دسمبر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق پروچانسلر اور معروف جغرافیہ داں پروفیسر محمد شفیع کا آج یہاں مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا وہ 85سال کے تھے۔ پروفیسر شفیع کا شمار دنیا کے نامور جغرافیہ دانوں میں ہوتا ہے اور آپ نے متعدد بار انٹرنیشنل کانفرنسوں کی صدارت کی۔ آپ شعبۂ جغرافیہ کے چیئرمین اور سائنس فیکلٹی کے ڈین کے ساتھ ڈائرکٹر اکیڈمک اسٹاف رہے۔ عالمی شہرت یافتہ جرنل 'جوغفز' کے بانی ایڈیٹر تھے جو ابھی تک جاری ہے۔

پروفیسر محمد شفیع نے عالمی شہرت یافتہ جغرافیہ داں Sir Daddy Stamp کی نگرانی میں اپنا پی۔ایچ۔ڈی مکمل کیا تھا۔ قومی اردو کونسل نے موصوف کی مشہور تصنیف ''زرعی جغرافیہ'' شائع کی ہے۔

پروفیسر علی محمد خسرو کے وائس چانسلری کے دور میں پروفیسر محمد شفیع پرو وائس چانسلر بنے۔ پسماندگان میں دولڑکے اور دولڑکیاں ہیں۔ آپ کے ایک صاحبزادے پروفیسر جمیل احمد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سول انجینئرنگ شعبہ کے چیئرمین ہیں۔ آپ کے انتقال کی خبر سے یونیورسٹی کے علمی حلقوں میں رنج وغم کا ماحول ہے۔

پروفیسر نقی حسین جعفری

● نئی دہلی۔ 9دسمبر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے شعبۂ انگریزی کے استاد پروفیسر سید نقی حسین جعفری کا انتقال ہوگیا۔ آج دوپہر اچانک دل کا دورہ پڑنے پر انھیں ہولی فیملی اسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں ان کی موت ہوگئی۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور 2بیٹیاں ہیں۔ ان کا تعلق مشہور خانقاہ کریمیہ، سلون ضلع رائے بریلی سے تھا۔ ان کی تدفین دوسرے دن صبح 11 بجے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں کی گئی۔ وہ اگرچہ انگریزی کے پروفیسر تھے لیکن اردو زبان وادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

مولانا فضل الرحمٰن

● رام پور۔ 9دسمبر، رام پور ایک بابرکت شخصیت سے محروم ہوگیا، جب عالم بے بدل مولوی رفیق صاحب مرحوم کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا انتقال ہوگیا۔ وہ طویل عرصے سے علیل تھے۔ مرحوم کا رام پور میں بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے ان کے معتقد تھے۔ انھیں عام طور پر عالم جذب میں سڑکوں پر کھڑے اور آسمان کی طرف انگلی اٹھائے دیکھا جاسکتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے والد مرحوم مولوی رفیق صاحب کی طرح وہ بھی ولی کامل تھے۔ دنیاوی طمع سے دور ہر شخص کو دعائیں دینا اور ہر معتقد کے سر پر ہاتھ پھیرنا ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ وہ کافی عرصے سے علیل تھے۔ ان کے انتقال کی خبر شہر میں پھیلی تو ہزاروں کی تعداد میں ان کے عقیدت مند ان کے مکان واقع گلی فرنگن پر جمع ہوگئے جن میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی تھے۔ ان کی نماز جنازہ قلعہ کے میدان میں ادا کی گئی، جس میں ہزاروں افراد شریک تھے۔ نماز جنازہ کی امامت مولوی مظاہر اللہ خاں نے کی۔

□□□

نشاط روح

شاعر: اصغر گونڈوی

اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام ''نشاط روح'' (مرتب: مرزا احسان احمد) کی پہلی اشاعت 1925 میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے اور دوسری اشاعت (مرتب: اقبال احمد سہیل) 1982 میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے عمل میں آئی تھی۔ اقبال احمد سہیل نے اس مجموعے کو بڑی دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ مرزا احسان احمد کے دیباچے اور مقدمے کے بعد انھوں نے ''تبصرہ'' کے عنوان سے اصغر گونڈوی کی شاعری کا مبسوط محاکمہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے محاسن کو موسیقی، بت تراشی، ایجاد وتخلیق، مصوری اور اسرار ومعارف کے الگ الگ عنوانات سے سمجھنے کی کوشش کے بعد آخر میں اصغر گونڈوی کا کلام شامل کیا ہے۔ اصغر گونڈوی کی غزلوں کی ہمہ گیری اور اثر انگیزی کے مطالعے کے لیے اس نسخے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 73، قیمت: -/49 روپے

تبصرہ وتعارف

● **مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے**

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

صفحات: 592، قیمت: 258 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 66

مبصر: پروفیسر مجاور حسین رضوی، 534، اترسوئیا، الہ آباد (یو۔ پی)

مرزا سلامت علی دبیر، اردو شاعری کا وہ روشن ترین نقطہ ہیں جن کے تذکرے کے بغیر ادبی تاریخ نامکمل رہتی ہے۔ حالات زمانہ کی ستم ظریفی کہنا چاہیے کہ ان کے بارے میں بیشتر کتابیں ''موازنہ انیس و دبیر'' کے رد میں وجود میں آئیں۔ ''ردّ الموازنہ'' اور ''المیزان'' تو اسی مطمع نظر سے لکھی گئیں، ''حیات دبیر'' (افضل حسین ثابت) بظاہر دبیر پر لکھی گئی ہے لیکن ثابت کے ذہنی پس منظر میں شبلی اور انیس جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ طرفہ ستم یہ ہوا کہ دبیر کا پورا کلام اب دستیاب نہیں ہے۔ ''سبع مثال'' کا بہت سے لوگ اب نام ہی نہیں جانتے''، ''دفتر ماتم'' کی جلدیں ناپید ہیں۔ کچھ مرثیے پروفیسر اکبر حیدری اور تقی عابدی کی وجہ سے دستیاب ہیں یا پھر سوز خوانوں کے بستوں کی زینت ہیں۔

مرزا صاحب کی ہشت پہل شخصیت تقریباً نظر انداز ہوتی جاتی ہے اور شبلی کی مضبوط جاندار اور خوبصورت نثر کی بدولت اگر مرزا صاحب کے کلام میں کچھ نظر آتا ہے تو وہ خیال آفرینی، مضمون بندی، نادر تشبیہات اور استعارات اور زبردست قوت متخیلہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دبیر کے یہاں اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی شخصیت کے ہر گوشے پر روشنی ڈالی جائے۔

مرزا محمد زماں آزردہ کا مقالہ ''سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے'' مرزا دبیر کی شخصیت اور مرثیہ گوئی پر مکمل روشنی ڈالتا ہے۔ مرزا صاحب کے نسب کے سلسلے میں جیسی بحث زماں صاحب نے کی ہے اس کے استناد میں کلام نہیں ہوسکتا۔ ایک ایک لفظ کے لیے انھوں نے مضبوط دلائل، شواہد اور دستاویزی ثبوت پیش کیے ہیں۔ شخصیت کے ظاہری مفہوم کے لیے، جتنے رخ ضروری سمجھے جاتے ہیں ان سب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کا لباس، وضع قطع، غذا سب کا تذکرہ ہے۔ سخاوت کے سلسلے میں صاحب ''شمس العلما'' نے مرزا صاحب کو ''برامکہ'' سے تشبیہ دی ہے جو یقیناً مبالغہ ہے۔ اس لیے کہ ''برامکہ'' اتنی دولت انیسویں صدی میں کسی شاعر کے پاس ہونا ممکن نہیں تھا۔ شاعر تو چھوڑیے شاہان اودھ یا نوابین کے خزانے بھی اتنے نہ تھے۔

زیر تبصرہ کتاب میں ضمنی معلومات بھی بہت قیمتی ہیں۔ مثلاً مرزا سلامت علی دبیر کے غالب، آتش، ناسخ وغیرہ سے روابط کے سلسلے میں ان لوگوں کی بھی تاریخ ولادت ووفات اسناد کے ساتھ درج کی گئی ہے۔ مرزا صاحب کے اسفار کا بھی تفصیلی ذکر ہے۔ ان کی وفات کے موقع کی نہایت پُر اثر انداز میں محمد زماں آزردہ صاحب نے تصویر کشی کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قاری خود مرزا دبیر کے جلوس رحلت میں شریک ہو۔

ابتدائی ڈیڑھ سو صفحات کا یہ وصف ہے کہ انھیں پڑھتے ہوئے قاری اپنے آپ کو اسی ماحول اور فضا میں مرزا دبیر کی مجلس سنتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ انداز بیان اتنا دلکش ہے کہ پوری عبارت میں کہیں بھی حشو وزوائد کا گزر نہیں اور سارے واقعات متحرک نظر آتے ہیں۔

مرزا دبیر کے شعری اکتسابات میں عموماً ان کی مرثیہ نگاری پر ہی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس گراں قدر تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلام ورباعی کے ساتھ غزل، قصائد، مثنوی بھی لکھا کرتے تھے۔ غزل میں انھوں نے ایسے شعر بھی کہے ہیں:

مئے سے توبہ کی ستمگر نے غضب تو دیکھو
جب کہ تیار مری خاک سے پیمانہ ہوا
وا حسرتا رہی یہ تمنا تمام عمر
اپنا دبیر کہہ کے پکارا نہ یار سے

تلوار کی تعریف میں یہ مصرع مرزا دبیر کا ہے:

جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

ان کی مشہور مثنویوں میں ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' کے علاوہ ایک مثنوی ''ممتاز نامہ'' بھی ملتی ہے۔ جہاں تک تاریخ گوئی کا سوال ہے مرزا دبیر نے اگر صرف میر انیس کی تاریخ رحلت کہی ہوتی تو وہ تمام قطعات پر بھاری ہوتی ان کا معرکتہ الآرا شعر:

آسماں بے ماہ کامل، سدرہ، بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

مرزا صاحب نے نثر میں بھی ''ابواب المصائب'' جیسی بے نظیر تصنیف پیش کی ہے جو رثائی ادب میں یقیناً ایک اضافہ ہے۔ مرزا صاحب کے مراثی

کی تعداد کا تعین بھی محمد زماں صاحب نے کیا ہے کہ وہ چار سو پچاس ہیں۔ انھوں نے مرزا دبیر کی صناعی پر اچھی بحث کی ہے مگر کتاب کے معیار کے مطابق یہ حصہ اور بہتر ہوسکتا تھا۔ غالباً صفحات کی تنگ دامانی سدِ راہ ہوئی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کتاب کے ضمنی مباحث بھی دلچسپ اور معلومات آفریں ہیں۔ مرزا دبیر اور ناسخ کے مبینہ اختلاف کے سلسلے میں، مصحفی کے سالِ وفات اور ناسخ کی شہرت کے زمانے کا تعین کیا ہے۔ مرزا دبیر کے بھائی نظیر کا تذکرہ بھی ہے۔ شاد عظیم آبادی پر دو سطری تبصرہ بے اختیار قاضی عبدالودود کی یاد دلاتا ہے۔ راجہ میوہ رام اور تسخیر، ملکہ زمانیہ، بادشاہ بیگم، امام باندی مرحومہ کے تذکرے اہم بھی ہیں، دلچسپ بھی اور معلومات افزا بھی۔ ضمنی معلومات کا ذخیرہ اس کتاب میں ملتا ہے۔

ان تمام خوبیوں کے ساتھ جب پیش لفظ میں مرزا دبیر کی تصانیف میں ''شمس الضحیٰ'' کا نام دکھائی دیتا ہے تو بے اختیار سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ محمد زماں صاحب نے شمس الضحیٰ (مولفہ مولوی صفدر حسین) کے بیانات پر بہت بھروسہ کیا ہے۔ وہ کتاب فارسی میں ہے اگر فارسی کا ترجمہ بھی شامل کرلیا گیا ہوتا تو دورِ حاضر کے بیشتر طالب علموں کو یقیناً فائدہ ہوتا۔ انھوں نے حوالے میں رثائی ادب کے تقریباً تمام اہم محققین خصوصاً اکبر حیدری، نیر مسعود، کاظم علی خاں وغیرہ کو شامل کیا ہے۔ ثانوی ماخذ کے بجائے براہ راست مصادر کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ ''دفترِ ماتم'' کی 14 جلدوں کے مراثی کے مطلع بھی درج کیے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کون سا مرثیہ کس جلد میں ہے۔

مرزا محمد زماں اپنے نام کے آگے آزردہ لکھتے ہیں، انھیں آزردہ کی جگہ آسودہ لکھنا چاہیے۔ شخصیت اور کارنامے کے سلسلے میں جو چند بہترین مقالے لکھے گئے ہیں مثلاً ''امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے'' (حسینی شاہد) ''فانی حیات اور کارنامے'' (مغنی تبسم) امام بخش ناسخ (شبیہ الحسن) انھی کی صف میں مرزا محمد زماں کے اس مقالے کو جگہ ملنی چاہیے۔

راقم الحروف یہاں بے اختیار یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ مرزا دبیر کے مراثی اب کمیاب سے نایاب کی منزل سے گزرتے ہوئے ''ناپید کی منزل'' تک پہنچ رہے ہیں۔ ان پر لکھی گئی کتابیں مثلاً ''حیات دبیر'' اور ''المیر ان'' عنقا ہیں۔ کتنا اچھا ہو مرزا محمد زماں ''دفترِ ماتم'' کی جلدیں مرتب کرکے قومی کونسل سے شائع کرادیں۔

یہ کتاب پانچ سو بانوے صفحات پر مشتمل ہے۔ سات ابواب ہیں، قیمت دوسو روپے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

● **جامع تاریخ ہند (عہد سلطنت)**

مورخین: محمد حبیب/خلیق احمد نظامی

صفحات: 1000، قیمت: 306 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔66

مبصر: پروفیسر ظفر احمد نظامی، 164، ذاکر باغ، اوکھلا، نئی دہلی-110025

انڈین ہسٹری کانگریس نے، جو ہر سال مختلف شہروں میں اپنے اجلاس منعقد کرتی رہتی ہے 1940 میں اپنے لاہور میں منعقدہ اجلاس میں جدید ترین تحقیقات پر مبنی ''جامع تاریخ ہند'' یعنی A Comprehensive History of India کی تیاری اور بارہ جلدوں میں اس کی اشاعت کا فیصلہ کیا تھا کہ وہ ہندوستانی تاریخ کے طلبہ کے لیے ایک حوالہ جاتی کتاب کی حیثیت سے کام آسکے۔ 1943 میں انڈین ہسٹری کانگریس کے اجلاس منعقدہ علی گڑھ میں اس پروجیکٹ کی منصوبہ سازی کی گئی اور مورخین کے ایک بورڈ کا تقرر عمل میں آگیا اور توقع کی گئی کہ اس کی اشاعت جلد ہی عمل میں آجائے گی تاہم تقسیم وطن کے بعد کے سیاسی حالات کے علاوہ ایسی صورت حال پیش آتی گئی کہ یہ سلسلہ ختم ہونے ہی میں نہیں آیا۔ آخر کار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مستند اور معتبر پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

مورخین کے الفاظ میں ''چونکہ ہندوستان کی تاریخ ہمارے شمال اور شمال مغرب کے ممالک سے قریبی طور سے وابستہ ہے لہٰذا ہم نے یہ بہتر سمجھا کہ ہم اسلام کے عروج سے لے کر بابر کے عہد تک ان ممالک کے ایک عام جائزے سے اس جلد کا آغاز کریں تاکہ ہندوستانی اور ایشیائی تاریخ کے ارتقا کو زیادہ وسیع تناظر میں دیکھا جاسکے۔''

''جامع تاریخ ہند'' سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا باب ایشیائی ماحول سے متعلق ہے جو مسلمانوں میں بادشاہت، طبقۂ امرا کی ابتدا، خوارزمی سلطنت، چنگیز خاں کے عروج، عجم پر حملے، قاآن اور امیر تیمور تک کا احاطہ کرتا ہے۔ اس باب کی اہمیت میں اضافہ اس سبب سے ہوجاتا ہے کہ اس میں اسلام کے عروج اور ہندوستان میں اس کی آمد کی تفصیل درج ہے۔

دوسرے باب میں دہلی سلطنت کی بنیاد پڑنے کے وقت ہندوستان کی حالت، غوری کی تاریخ، سلطان معزالدین کی ہندوستانی مہمیں، شمالی ہندوستان کی فتح اور ترکی تسلط کی اہمیت کی تفصیلات درج ہیں۔ ان میں ذات پات کا نظریہ رائج تھا جو بعد ازاں ترکوں کے دباؤ میں آگیا۔ اس عہد میں مولانا رضی الدین حسن صاغانی اور شیخ حمید الدین صوفی کی سیرت سے بحث کی ہے۔ غور سے متعلق تفصیلات بیان کرنے سے پہلے سلطان معزالدین کی ہندوستانی

مہمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ملتان، اچھ، ہزوالا، پشاور، لاہور، بھٹنڈا اور ترائن کی جنگوں کا ذکر ہے۔ مورخین کے مطابق ترائن کی جنگ میں راجپوتوں کی شکست نے چوہان حکومت کو حملہ آوروں کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا۔ ترائن میں اپنی کامیابی کے فوراً بعد معز الدین نے سوالک کے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا اور کہرام کو ایبک کے حوالے کر کے غزنی واپس ہو گیا۔

تاہم معز الدین کئی بار ہندوستان آیا اور اس نے بنارس کی مہم اور کئی مہمات میں کامیابی حاصل کی۔ گوالیار کے قلعہ پر قبضہ کیا اور دوسری فتوحات حاصل کیں لیکن اپنی آخری مہم میں معز الدین کو شکست ہوئی اور وہ قتل کر دیا گیا۔ تاہم قتل سے پہلے وہ ہندوستان پر قابض ہو چکا تھا۔

1206 میں ہندوستان میں قطب الدین ایبک حکمراں ہو گیا لیکن 1210 میں چوگان کھیلتے ہوئے اپنے گھوڑے سے گر پڑا اور زرین کی نوکیلی موٹھ اس کی پسلی میں گھس گئی اور اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان شمس الدین التمش بادشاہ ہوا۔ وہ ترکوں کے البری قبیلے سے تھا۔ اس کا دور بغاوتوں کو فرو کرنے اور چنگیز خاں کا مقابلہ کرنے میں گزرا۔ 1236 میں اس کا انتقال ہو گیا۔ التمش کی وفات کے بعد رکن الدین فیروز شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کی تین ممتاز خوبیاں تھیں۔ وہ خوبصورت اور اچھے قد وقامت کا مالک تھا۔ نرم خو تھا اور بے انتہا سخی تھا۔ اس کی عیش پسندی نے اسے دلّی کا سلطان بننے کے لائق نہیں رکھا۔

شمس الدین التمش کی موت کے بعد رضیہ سلطانہ کو تخت نشین کیا گیا جو بڑی دلیر ثابت ہوئی۔ اس نے اپنے دشمنوں کا قلع قمع کیا اور ایک حبشی القونیہ سے شادی کر لی۔ اس نے تین سال چھ مہینے اور چھ دن حکومت کی لیکن قتل کر دی گئی۔ رضیہ کے بعد معز الدین بہرام شاہ تخت نشین ہوا۔ 10 مئی 1242 کو اسے بھی ترک امرا نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد سلطان علاء الدین مسعود اور سلطان ناصر الدین محمود نے حکومت کی اور بالآخر الغ خاں یعنی غیاث الدین بلبن تخت نشین ہوا۔

سلطان بلبن نہایت دلیر بادشاہ تھا۔ اس نے شاہی شان وشوکت کو دوبالا کیا۔ ملک میں ضبط ونظم قائم کیا۔ قابل اعتماد لوگوں کو اپنی مشاورتی کونسل کا رکن بنایا۔ میوں کو تہس نہس کیا۔ فوج کی تشکیل نو کی۔ انتظامی اقدامات اور حکومت کی تنظیم کی بغاوتوں کو فرو کیا اور بادشاہ کو وقار بخشا۔ اس کے بعد کیقباد تخت نشینی ہوا لیکن ایک افسر نے اسے کپڑے کی گٹھری میں باندھ کر دریائے جمنا میں پھینک دیا۔

کتاب کا چوتھا باب خلجی خاندان کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں جلال الدین فیروز کی تخت نشینی، عسکری مہمات اور اس کے قتل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس باب کے دوسرے حصے میں علاء الدین خلجی کی تخت نشینی، اور مخلوط حکومت، ملتان، گجرات اور رنتھمبور کی فتح کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اسی باب کے تیسرے حصے میں علاء الدین کے محکمۂ مالگذاری میں اصلاحات کی تفصیلات درج ہیں۔ اگر چہ ان اصلاحات کا ذکر دوسری تاریخ کی کتابوں میں بھی درج ہے لیکن اس کتاب میں ان اصلاحات کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ علاء الدین نے محکمہ سراغ رسانی کی تنظیم کی، دہلی میں شراب پر پابندی عائد کر دی، امرا کی روک تھام کی۔ اس سلسلے میں یہ حقیقت قابل ذکر ہے کہ تاریخ کی بعض کتابوں میں چتوڑ کی رانی اور علاء الدین کے فرضی قصے کو خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا گیا ہے، اس کتاب نے اسے غلط ثابت کیا ہے۔ اس باب کے چوتھے حصے میں علاء الدین خلجی کے معاشی ضوابط کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس باب کے پانچویں حصے میں آخری منگول حملے کی تفصیل درج ہے اور چھٹے حصے میں علاء الدین کی دکن پالیسی کی تفصیل ہے۔

علاء الدین خلجی کے بعد قطب الدین مبارک شاہ خلجی تخت نشین ہوا۔ اس نے گجرات سے متعلق انتظامات کیے، دیوگری پر فاتحانہ حملہ کیا لیکن اسے پھاؤڑے سے مار دیا گیا۔ اس کے بعد ناصر الدین خسرو تخت نشین ہوا۔

اس کتاب کا پانچواں باب تغلق خاندان سے متعلق ہے۔ ابن بطوطہ کے لفظوں میں ''تغلق ترکوں کے قراونہ قبیلے کا تھا جو ترکستان اور سندھ کے درمیان پہاڑی علاقے میں آباد تھے'' حصول اقتدار کے بعد غیاث الدین تغلق نے اپنی توجہ خالی خزانہ کی بحالی اور سلطنت کی مالیاتی تنظیم کی۔ اس نے فوج کی از سرِ نو تشکیل کی۔ مخالف مہمات میں حصہ لیا۔ سلطان وقت یعنی غیاث الدین تغلق اور حضرت نظام الدین کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دی گئی ہیں۔ شیخ کو سلطان نے پیغام بھیجا تھا کہ اس کی بنگال کی مہم سے واپسی تک دہلی چھوڑ دیں تب شیخ نے فرمایا تھا کہ ''ہنوز دلّی دور است۔'' تاہم محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی نے اسے غیر مستند اور غیر معتبر بتایا ہے۔

غیاث الدین تغلق کے بعد سلطان محمد تغلق تخت نشین ہوا۔ اس نے نئے علاقوں کو تسخیر کیا، بغاوتوں کو فرو کیا اور اس پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی راجدھانی کو دولت آباد اور طلائی سکّوں کو اپنی کرنسی میں ڈھالا لیکن یہ ایک وقتی ضرورت تھی۔ 1342 میں اس کے انتقال کے بعد 1351 میں فیروز شاہ تغلق تخت نشین ہوا۔ اپنے دورِ حکومت میں اس نے کافی اصلاحات کیں۔ پیداوار کے مطابق محصول مقرر کیا، جمعہ کے خطبات میں گذشتہ بادشاہوں کے نام شامل کروائے۔ مہمات میں حصہ لیا۔ نہروں کی تعمیر کرائی، سول انجینئرنگ کو فروغ دیا، جمنا کے کنارے فیروز آباد کا شہر آباد کیا، کارخانے قائم کیے، باغات لگوائے۔ قیمتیں اور اجرتیں مقرر کیں۔

اس کتاب کا چھٹا باب سید خاندان پر مشتمل ہے جن کا دور اقتدار 1414 سے 1451 تک جاری رہا۔ ان میں خضر خاں سب سے پہلا حکمراں تھا جو سید تھا

اور اسی کے نام سے سید خاندان کی بنیاد پڑی۔ مبارک شاہ اس کا جانشین تھا جسے قتل کردیا گیا۔ اس کے جانشینوں میں محمد شاہ، سلطان اور علاء الدین شاہ تھے۔

اس کتاب کا آخری باب لودی خاندان پر مشتمل ہے۔ لودی خاندان کا بانی بہلول لودی تھا، اس کا جانشین سکندر لودی ہوا۔ تاتار خاں اور سلطان اشرف کے خلاف مہم چلائی۔ رائے بھنڈ کے خلاف مہم چھیڑی، حسین شرقی پر حملہ کیا، گوالیار، دھول پور کے خلاف مہمات چلائیں۔ ان کے علاوہ سکندر لودھی نے شہر آگرہ کی بنیاد 1506 میں رکھی۔ 21 نومبر 1517 کو گلے کے کینسر سے سکندر لودی کی وفات ہوئی۔ سکندر لودی کی وفات کے بعد سکندر لودی کے بڑے بیٹے ابراہیم لودی کو تخت نشیں کیا گیا۔ ابراہیم لودی سے متنفر ہوکر پنجاب کے امرا نے ہندوستان پر حملے کے لیے بابر کو مدعو کرنے کے لیے سکندر لودی کے بھائی عالم خاں کو کابل بھیجا۔ بابر نے اپنے آدمیوں کو جائزہ لینے کے لیے بھیجا۔ اپریل 1526 میں بابر نے ہندوستان پر حملہ کردیا۔

کتاب کا اردو متن نہایت دلچسپ ہے اور شروع سے آخر تک قاری کو محو رکھتا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان قابل مبارکباد ہے جس نے تاریخ کی اتنی معتبر اور مستند کتاب ممتاز و نامور مورخین سے تیار کروائی۔

● **کلیات سعادت حسن منٹو (دوسری جلد)**

ترتیب: شمس الحق عثمانی

صفحات: 575، قیمت: 274 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 66

مبصر: ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈی-3، ٹیچرز ٹرانزٹ ہاسٹل، مکھرجی نگر، دہلی-9

اس میں کوئی شک نہیں کہ منٹو ہمارا بڑا افسانہ نگار ہے۔ منٹو کے افسانوں کا مرکزی موضوع انسان ہے۔ وہ انسان کو نہ تو معاشرتی خانوں میں بانٹ کر دیکھتا ہے نہ مذاہب کے زمرے میں رکھ کر دیکھتا ہے، وہ انسان کو نہ تو فرشتہ خصلت ماننے کو تیار ہے نہ شیطان صفت اور نہ ہی وہ اسے اپنے افسانوں میں ظالم و مظلوم کے طور پر پیش کرتا ہے۔ وہ تو بس انسان کی فطرت، جبلت اور نفسیات کی پرتیں کھولتا جاتا ہے اور اپنے قاری سے کہتا ہے دیکھو انسان کے کتنے روپ ہیں، کتنے رنگ ہیں، ہر ظاہری انسان سے ایک باطنی انسان کس طرح نمو کرتا ہے۔ اگر آپ منٹو کے افسانوں کا تاریخی ترتیب سے مطالعہ کریں تو آپ کو منٹو کے یہاں ابتدائی انسان بھی نظر آئے گا، نامکمل انسان بھی اور انسان کامل بھی۔ المیہ یہ ہے کہ منٹو کو فن پر دسترس ہے اور صائب فکر رکھنے کی وجہ سے مقبولیت ملنے کے بجائے جنس کے موضوع پر لکھے گئے اپنے افسانوں کی بنا پر شہرت حاصل ہوئی۔ عام پڑھے لکھے لوگوں کے بڑے حلقے اور سنجیدہ قارئین کے ایک مخصوص طبقے نے بھی منٹو کو اسی موضوع پر لکھے گئے افسانوں کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی۔ ان کے چند اہم افسانوں کے سحر نے لوگوں کو، ان کے روایتی افسانہ نگاری سے انحراف، موضوعات کے انتخاب، تکنیک کے تنوع، زبان کی شکست و ریخت کے تجربے، اہم فکر کو سہل انداز میں بیان کرنے کے سلیقے اور کہانی گھڑنے کے ہنر جیسی صلاحیتوں کی طرف متوجہ ہونے کا خاطر خواہ موقع نہیں دیا۔ کم لوگ واقف ہیں کہ اپنے عہد کے اس آزاد منش، انقلاب پسند اور جدید تر آدمی نے افسانوں کے علاوہ ناول، ڈرامے، خطوط، فیچر، فلم اسکرپٹ، خاکے، اور مضامین کو بھی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ منٹو کے تحریر کردہ ان غیر افسانوی اصناف میں بھی فنی حسن اور جذبے کی صداقت ان کے افسانوں سے کسی طور کم نہیں۔

نثری کلیات کی اشاعت کے رواج نے یہ مرحلہ آسان کردیا ہے کہ قاری مصنف کے علمی و ادبی قد و قامت کا اندازہ ناقد کی معلومات اور اس کی رائے پر انحصار کرنے کے بجائے براہ راست اصل تصنیف کے مطالعے سے کرسکتا ہے۔ ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' نے کلیات سعادت حسن منٹو کی تدوین و ترتیب کی ذمے داری پروفیسر شمس الحق عثمانی کو سونپی تھی جسے وہ بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ ان کی مرتب کی ہوئی مذکورہ کلیات کی دوسری جلد منظر عام پر آچکی ہے جس میں منٹو کی پانچ کتابیں ''افسانے اور ڈرامے''، ''چغد''، ''لذت سنگ''، ''سیاہ حاشیے''، اور ''خالی ڈبے خالی بوتلیں'' شامل ہیں۔ پہلی کتاب میں چھے ڈرامے اور سات افسانے ہیں، دوسری کتاب ''چغد'' میں نو افسانوں کے علاوہ سردار جعفری کا اپریل 1948 کا تحریر کردہ ایک دیباچہ بھی ہے جو مجموعے کی اشاعت اول میں شائع ہوا تھا۔ لذت سنگ میں منٹو کے کبھی بدنام زمانہ رہے تین افسانوں ''بو''، ''دھواں'' اور ''کالی شلوار'' کے علاوہ اپنے متنازعہ فیہ افسانوں کے جواز میں ان کے تین اہم مضامین: ''سفید جھوٹ''، ''افسانہ نگار اور جنسی مسائل'' اور ''کسوٹی'' شامل ہیں۔ ان کے علاوہ دو اور تحریریں ''ایک فیصلہ'' اور ''ایک اور فیصلہ'' بھی زینت کتاب ہیں۔ پہلی تحریر ایک امریکی جج کا فیصلہ ہے جس میں جیمز جوائس کے ناول ''یولی سیز'' کو غیر فحش قرار دیا گیا ہے جس کا ترجمہ محمد حسن عسکری نے کیا ہے۔ دوسری تحریر بھی ایک عدالتی فیصلہ ہے جس میں مشہور ناول نگار ارسکائن کیڈویل کے ناول ''گوڈز لیٹل ایکٹر'' پر ''اخلاقی برائیوں کے انسداد کی انجمن'' کی جانب سے چلائے گئے مقدمے کے خلاف فیصلہ ہے۔ اس کا ترجمہ دوست محمد طاہر نے کیا تھا۔ منٹو کے تینوں مضامین ادب، جنس اور فحش نگاری کے نازک مسائل اور اس کے افتراق و امتیازات سے متعلق ہیں۔ اس مجموعے کے شروع میں ان کا ایک طویل مقدمہ بھی ہے جس میں انھوں نے اپنے افسانوں پر فحش نگاری کے لگائے گئے الزامات کا مسکت جواب اور اس

سلسلے میں خود پر چلائے گئے مقدمات کا مدلل جواب دیا ہے اور اپنے افسانوں کو فحش کہنے والوں کے لیے مثنوی میر درد اور مومن کی مثنوی کے وہ اقتباسات پیش کیے ہیں جو بقول منٹو ان کے افسانوں سے کہیں زیادہ فحش ہیں۔ ''سیاہ حاشیے'' میں 32 افسانچے شامل ہیں، اور ''حاشیہ آرائی'' کے عنوان سے پروفیسر حسن عسکری کا پیش لفظ بھی ہے جس میں منٹو کے فن اور اس کی فکر کی طرف واضح اشارات موجود ہیں۔ کلیات کا آخری مجموعہ منٹو کے ایک مختصر سے رسمی پیش لفظ کے علاوہ تیرہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ یوں پورے کلیات میں مضامین، ڈرامے اور مقدموں کے علاوہ منٹو کے چھوٹے بڑے، اہم اور قدرے غیر اہم 64 افسانے شامل ہیں۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ پروفیسر شمس الحق عثمانی کا شمار عصر حاضر کے اہم محققین میں ہوتا ہے، اس کلیات کی ترتیب میں انھوں نے تحقیق و تدوین کے جملہ اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے، صحیح ماخذ تک پہنچنے اور کلیات کو اغلاط سے پاک رکھنے کے لیے جس کاوش اور ژرف بینی سے انھوں نے کام لیا ہے اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کلیات کمپوزنگ اور طباعت کے اعتبار سے کونسل کے معیار حسن اور مواد کے لحاظ سے میزان استناد پر پورا اترتا ہے۔

● تنقیدی اور تہذیبی مطالعے

مصنفہ: طاہرہ پروین

صفحات: 191، قیمت: 93روپئے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔66

مبصر: مشکور معینی، 224، پیریار ہاسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-67

''تنقیدی اور تہذیبی مطالعے'' طاہرہ پروین کی ایک تنقیدی و تجزیاتی کتاب ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں کل آٹھ اور حصہ دوم میں سات مضامین شامل ہیں جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ مصنفہ نے ان مضامین کے ذریعے ہندوستانی تہذیب وثقافت پر روشنی ڈالنے کی خصوصی سعی کی ہے۔ اردو ادب میں ہندوستانی تہذیب وتمدن کی جھلکیاں کم وبیش ہر دور میں دیکھنے کو ملتی ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ایک زمانے تک ہمارے ادبا وشعرا اور قاری کا ذہن ومزاج ایرانی تہذیب وثقافت میں رچا بسا رہا۔ ایرانی تہذیب کے اثرات ان پر اتنے گہرے تھے کہ انھیں دوسری تہذیب قابل قبول نہ تھی۔ جن لوگوں نے اپنی تہذیب وثقافت یعنی ہندوستانی تمدن کو جلا بخشی، انھیں اپنے عہد میں کوئی خاص شہرت نہ مل سکی۔ نظیر اکبرآبادی کا نام ان میں سرفہرست ہے۔ نظیر اکبرآبادی پہلا شاعر ہے جس نے اردو شاعری میں خالص ہندوستانی تہذیب کو پیش کیا۔ بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ نظیر اکبرآبادی کی پوری شاعری، اپنے ملک کے تہذیبی آب ورنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس سے قبل اردو شاعری میں اس طرح کا رنگ روپ نظر نہیں آتا ہے۔ اسی بنا پر کلیم الدین احمد نے نظیر اکبرآبادی کو اردو شاعری کے آسمان پر پہلا درخشاں ستارہ کہا ہے۔

مذکورہ کتاب میں طاہرہ پروین نے اردو شعروادب میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کرنے والے پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی ترجیحات کا اندازہ مضامین کے عنوانات سے بھی ہوجاتا ہے، جیسے اردو شاعری اور کرشن بھگتی، اردو شاعری میں رام بھگتی، اردو شاعری میں ہولی کے رنگ، نظیر اکبرآبادی اور سری کرشن جی، نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں عوامی عناصر، نظیر اکبرآبادی کی نظم بنجارہ نامہ کے لفظیات کی تدریس وغیرہ۔ ان تمام مضامین میں مصنفہ نے نظیر کی شاعری کو مرکز میں رکھا ہے۔ اردو شعروادب میں رام اور کرشن کا ذکر ہو یا ہولی اور دیوالی کی منظرکشی، شروع سے ملتی ہے لیکن نظیر نے انھیں خصوصی اہمیت دی ہے۔ نظیر رام اور کرشن کی بھگتی کے بیان میں ہندی کے شاعروں کو بھی مات دے دیتے ہیں۔ نظیر نے کرشن کے جتنے نام اپنی شاعری میں استعمال کیے ہیں، شاید اس کا ایک حصہ بھی ہندی کے شاعروں نے نہ کیا ہو؟ طاہرہ پروین نے نظیر کی شاعری میں مستعمل کرشن کے مختلف ناموں کو مذکورہ کتاب کے مضمون ''نظیر اکبرآبادی اور سری کرشن جی'' میں یکجا کرکے پیش کیا ہے۔ بنجارہ نامہ کی تدریس پر مضمون نظیر کی شاعری کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ ہر دور کا شاعر اپنے زمانے اور ماحول سے متاثر ہوتا ہے لیکن بڑا شاعر وہ ہوتا ہے جو اپنے تاثرات و کیفیات کو شعری پیکر میں ڈھالنے کے لیے اس لفظیات کا انتخاب کرے جس کی جڑیں سماج کے اندر ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو نظیر اکبرآبادی ایک بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے احساسات وتجربات کو ایسے لفظوں میں ڈھالا جن کا رشتہ ہماری زمین سے ہے۔

زیر نظر کتاب میں ''اردو داستانوں میں دلت زندگی کی تصویریں''، ''اردو شاعری اور فکشن میں دلت زندگی کی جھلکیاں''، ''بچوں کے لیے اقبال کی چند نظمیں — ایک مطالعہ'' اور ''میر انیس کے مرثیوں میں بچے'' ایسے مضامین ہیں جو دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔

● جونپور کی ادبی خدمات، تاریخ کی روشنی میں

مصنفہ: ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ

صفحات: 400، قیمت: 200روپئے

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: عطاء الرحمٰن قاسمی، شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، 80/C، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی-25

بلاریب ہندوستان کا چپہ چپہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ شاید ہی کوئی

شہر، کوئی قصبہ اور کوئی قریہ ایسا ہو جہاں تاریخ وثقافت کے انمٹ نقوش ثبت نہ ہوں، ان میں جونپور تو اپنی تاریخ وثقافت کے اعتبار سے بجاطور پر شیراز ہند کہلانے کا استحقاق رکھتا ہے، سلطنت شرقیہ کا مرکز جونپور ہی تھا جس کا جغرافیائی دائرہ عظیم آباد تک پھیلا ہوا تھا۔ جونپور کا بانی سلطان فیروز شاہ تغلق تھا اور شاہزادہ فتح خاں وہاں کا حاکم تھا، جو جواں عمری میں ہی فوت ہوگیا، اور دہلی میں محلہ نبی کریم میں مدفون ہوا۔

پیش نظر کتاب ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ کا تحقیقی مقالہ ہے، جس پر انھیں پی. ایچ. ڈی. کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں جونپور کی تاریخ اور وہاں کے حکمرانوں بالخصوص سلطان فیروز شاہ تغلق، شیر شاہ سوری، ابراہیم شاہ شرقی اور دیگر سلاطین شرقیہ کے حالات زندگی اور ان کے ادبی، ثقافتی اور تعمیری کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی حدود سلطنت بیان کی گئی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے جونپور کے حکمراں حسین شاہ شرقی کی موسیقی نوازی اور موسیقی کی نئی جہتوں کی ایجاد کا ذکر کیا گیا ہے۔'' غبار خاطر'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ امیر خسرو کے بعد ہندوستانی موسیقی کا سب سے بڑا محسن جونپور کا حسین شاہ شرقی تھا۔

باب دوم میں جونپور کی علمی، مذہبی اور تہذیبی روایت سے بحث کی گئی ہے۔ پورب میں اسلام کی آمد اور یہاں کے مبلغین کی دعوتی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، یہاں کے اسلامی مراکز دینی مدارس اور روحانی خانقاہوں اور ان سے وابستہ علما ومشائخ اور اصحاب فقہ وافتا کے رول پر بحث کی گئی ہے، اصلاح معاشرہ کے تعلق سے ان کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے اور عہد تغلق میں دہلی سے جونپور آنے والے علما ومشائخ کا والہانہ استقبال کا بھی ہلکا سا منظر سامنے لایا گیا ہے۔ علمائے جونپور کی مختلف فنون پر لکھی گئی کتابوں کا بھی تعارف کرایا گیا ہے۔ علمائے شرقیہ میں قاضی شہاب الدین کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے اور مختلف علوم وفنون پر ان کی کتابوں کا بھی تعارف کرایا گیا ہے۔ قاضی صاحب کی تصنیفات میں تفسیر ''بحر مواج'' بہت ہی مشہور ہے، جس کو درجۂ استناد و اعتبار حاصل ہے، اس کے مختلف خطی نسخے ملک کی مختلف لائبریریوں میں ملتے ہیں۔

باب سوم میں سرزمین جونپور پر برپا کی گئی تحریکوں اور دعوتی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہاں کی مشہور تحریکات میں ''تحریک مہدوی'' تھی جس کے بانی سید محمد جونپوری تھے۔ اکبر بادشاہ نے ''دین الٰہی'' کے قیام کا اعلان کیا تو جونپور کے قاضی القضاۃ ملایزدی جونپوری نے فتویٰ دیا تھا کہ بادشاہ مرتد ہوگیا ہے اور واجب القتل ہے۔ اکبر اپنے قتل کا فتویٰ سن کر اس قدر ناراض ہوا کہ ملایزدی جونپوری کو جمنا ندی میں غرق کروا دیا تھا۔ یہاں کی خالص دینی و مذہبی تحریک مولانا کرامت علی جونپوری کی تھی، جو مولانا سید احمد شہید بریلوی کے مرید خاص تھے۔ اس تحریک کے اثرات کس کس صوبے میں تھے، اس کا بھی بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ تحریک خلافت میں جونپور کا کیا رول رہا ہے، اس کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور خلافت تحریک میں حصہ لینے والے مجاہدین کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب کے آخر میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا یہ عربی شعر نقل کیا گیا ہے جس میں حضرت نے جونپور کی علمی وثقافتی عظمت کا ذکر کیا ہے:

من جو نفور ذهبت رياح رضى
منها تعطرت الدنيا ما فيها

باب چہارم میں جونپور کے شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں بعض کا شمار اپنے وقت کے اساتذہ میں ہوا۔ ہر باب کے آخر میں کتابیات کا اندراج کیا گیا ہے جس سے کتاب کا استناد بڑھ جاتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان دنوں یونیورسٹیوں میں جو تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں ان میں یہ کتاب اپنی زبان وبیاں اور تحقیقی تلاش وجستجو کے اعتبار سے منفرد نوعیت کی ہے۔

● امیر خسرو
مرتب: شیخ سلیم احمد
صفحات: 439، قیمت: 300 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی
مبصر: شبیر عالم، کمرہ نمبر 114، ڈی.ایس.کوٹھاری ہاسٹل، دہلی یونیورسٹی-7

زیر تبصرہ تالیف امیر خسرو کے حالات زندگی اور ان کے شعروادب کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ امیر خسرو کا شمار ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے بنیادگزاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی ایک حیثیت مورخ کی بھی ہے اور قرون وسطیٰ کے مستند مورخین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ امیر خسرو نے 1253 میں بلبن کے دور حکومت میں آنکھیں کھولی، خلجی دور میں عروج حاصل کیا اور تغلق دور میں انتقال کیا۔ انھوں نے دہلی کے سات بادشاہوں، غیاث الدین بلبن، معزالدین کیقباد، جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی، قطب الدین مبارک شاہ خلجی، غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق کا دور حکومت دیکھا۔

بنیادی طور پر امیر خسرو شاعر ہیں۔ انھوں نے فارسی اور ہندوی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ فارسی میں ان کا نام نظامی، فردوسی، حافظ اور سعدی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اردو زبان کی ابتدا وآغاز کے ڈانڈے ہم ان کی

"ہندوی" شاعری سے ہی ملاتے ہیں۔

شیخ سلیم احمد نے اس کتاب میں امیر خسرو سے متعلق نہایت قیمتی مواد یک جا کر دیا ہے۔ جو نوادرات عام دسترس سے دور ہو چکے تھے اور حالات کی ستم ظریفی کے باعث نظروں سے اوجھل تھے انھیں شیخ سلیم نے ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس کام میں انھوں نے جو محنت کی ہے اس کا اندازہ کتاب کے مندرجات دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے۔ کتاب دس مقالوں پر مشتمل ہے۔ پہلا مقالہ امیر خسرو کی اپنی تحریر پر مبنی ہے۔ امیر خسرو فرماتے ہیں کہ "مجھ سے پہلے شاہان سخن میں کسی کے تین دیوان نہ تھے (دیوان کے ایک معنی دربار کے بھی ہیں) مسعود سعد سلمان کے البتہ تین دیوان تھے۔ ایک عربی، دوسرا فارسی تیسرا ہندی۔ صرف فارسی میں تین دیوان سوائے میرے کسی کے نہیں۔ دیوان اوّل "تحفۃ الصغر" بچپن کا کلام ہے دوسرا "وسط الحیوٰۃ" "غفوان شباب کا اور تیسرا یہ "غرۃ الکمال"۔"

دوسرا مقالہ مولانا محمد حسین آزاد کی مشہور کتاب "آب حیات" سے ماخوذ ہے۔ آزاد نے "آب حیات" میں امیر خسرو سے متعلق جو باتیں لکھی ہیں وہ سب اس میں آگئی ہیں۔ تیسرا مقالہ مضمون علامہ شبلی نعمانی کی کتاب "شعر العجم" سے اخذ کیا گیا ہے۔ جو علمی اور تحقیقی اعتبار سے بلند درجے کا حامل ہے۔ چوتھا مقالہ منشی احمد سعید مارہروی کی کتاب "حیات خسرو" (1909) پر مبنی ہے اور نہایت جامع و مفید معلومات کا خزانہ ہے۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔ پانچواں مقالہ حافظ محمود خاں شیرانی کا ہے۔ یہ وہ مشہور مقالہ ہے جس میں شیرانی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ "خالق باری" امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے بلکہ 1031 میں ضیاء الدین خسرو نام کے ایک شخص نے لکھی۔ چھٹا مقالہ "حضرت امیر خسرو دہلوی" پروفیسر حبیب کے انگریزی مقالے کا ترجمہ ہے جو علی گڑھ میگزین میں 1925 میں شائع ہوا تھا، شیخ صاحب نے ڈھونڈ نکالا اور اردو میں اس کا سلیس ترجمہ کیا۔ ساتواں مقالہ محمد یٰسین مظہر صدیقی کا ہے بعنوان "امیر خسرو کا تاریخی شعور ایک توقیتی مطالعہ"، اس میں عہد کیقباد سے لے کر عہد تغلق تک کے حالات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ مضمون تاریخی اعتبار سے کافی اہم ہے۔ آٹھواں مقالہ ڈاکٹر تاراچند کا ہے بعنوان "امیر خسرو اور ہندوستان" اس کی اہمیت بھی مسلّم ہے۔ ڈاکٹر کنور محمد اشرف کا مضمون "امیر خسرو بحیثیت تاریخی ماخذ" بھی اہم ہے۔ آخر میں نواب اسحٰق صاحب کا وہ معلوماتی مضمون شامل ہے جس میں 1917 سے 1933 کی درمیانی مدت میں امیر خسرو پر لکھی گئی کتابوں کے نام کے ساتھ سنین اشاعت بھی درج ہے۔

امیر خسرو پر کئی کتابیں لکھی اور مرتب کی گئی ہیں، ان میں یہ کتاب اپنی جامعیت کے لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

● مطالعے سے آگے

مصنف: عطا عابدی

صفحات: 184، قیمت: 200 روپے

ناشر: مکتبہ افکار، بیت العطا، فقیرا خاں (اردو بازار)، دربھنگہ (بہار)

مبصر: پروفیسر محمد محفوظ الحسن، حیدر منزل، روڈ نمبر-2، نیو کریم گنج، گیا، بہار

عطا عابدی ایک ابھرتے ہوئے قلم کار ہیں۔ "مطالعے سے آگے" ان کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں کل 25 مضامین، تبصرے اور مقدمے/پیش لفظ شامل ہیں۔ ان میں 15 مضامین، 7 تبصرے اور 3 پیش لفظ یا مقدمے ہیں۔

پہلے مضمون "احوال آدمی/ انسان" میں قدیم و جدید اردو شعرا کی شاعری کے حوالے سے اس انسانی تصور کی تلاش کی کوشش ملتی ہے جو اس کائنات کی تخلیق سے وابستہ ہے۔ دوسرے مضمون میں مردم شناسی کے معیار کیا ہیں یا کیا ہوسکتے ہیں اس کی دید و دریافت بہادر شاہ ظفر کی شاعری کی روشنی میں کی گئی ہے اور یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ "بہادر شاہ ظفر کی شاعری میں جہاں انسانی جذبات و اقدار کے مختلف رنگ و پہلو سامنے آتے ہیں وہیں انسان شناسی یا مردم شناسی کے عوامل بھی اپنی موجودگی کا توانا احساس دلاتے ہیں۔" تیسرے مضمون میں محمود ایاز کی شاعری کو سوز ناتمام کی شاعری قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "محمود ایاز سیاست آگاہ اور بے ثباتی عالم کا رمز شناس شاعر ہے۔" پورا مضمون اسی بنیادی نکتے کی تشریح و تفصیل پر مرکوز و مرتکز ہے۔ صدیق مجیبی کے شاعرانہ اختصاص کا مختصر مگر جامع تعارف "صدیق مجیبی کی غزلیں" کے ذریعے کرایا گیا ہے۔ "عزیز بگھروی کی شاعری کا فکری و نظری مزاج" میں ان کی شاعری کے فکری و فنی مزاج کی وضاحت کی گئی ہے جس پر اسلامی اثرات غالب ہیں۔ اردو میں ادب اطفال کی تخلیق کی جانب بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ ایسے فنکار جنھوں نے ادب اطفال کی تخلیق کی ہے ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ چھٹا مضمون اردو کے ادب اطفال میں ناوک حمزہ پوری کے اختصاصی پہلو اور ان کی خدمات کو اجاگر کرنے کی غرض سے تحریر کیا گیا ہے اور ان کی کتابوں کے حوالوں سے ان کے اختصاص کو روشن کیا گیا ہے۔ نوشاد ہندوستانی موسیقی کا ایک معتبر نام ہے۔ "آٹھواں سر" اسی موسیقار کے شعری مجموعے کا نام ہے۔ عطا عابدی کا کہنا ہے کہ "آٹھواں سر کی شاعری موسیقی کے متعلقات کو پیش کر کے بہ الفاظ دیگر موسیقی کے ساتوں سر کی دنیا کے احوال رقم کر کے اردو شاعری کو ایک نئے موضوع اور ذائقے سے آشنا کرتی ہے۔" اس کے علاوہ "آٹھواں سر" میں زندگی کے مختلف مسائل و واردات اور عصر حاضر

کے معاملات بھی خوب صورتی سے ادا ہوئے ہیں۔'' اس سلسلے میں مصنف کی یہ رائے بھی قابل غور ہے کہ'' اگر ان کی شاعری توجہ حاصل نہیں کرسکی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ بطور موسیقار نوشاد کی حیثیت اتنی ہمہ گیر، اتنی مستحکم اور اتنی مقبول ہوچکی ہے کہ ان کی شاعری اس سے آنکھیں ملانے کی تاب نہیں رکھتی۔'' ''غبار فکر اور احوال اطفال'' کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ'' غبار فکر'' میں گوہر نے بچے کی پرورش و پرداخت، تعلیم و تربیت نیز ان کے دیگر مسائل کی طرف خصوصی توجہ کرکے غزل کو ایک نئے جہان موضوع سے متعارف کرایا ہے۔'' غیاث احمد گدی اردو فکشن کا معتبر نام ہے۔ اردو افسانے کی کوئی تاریخ غیاث احمد گدی کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی: مطالعہ، تعارف، تبصرہ'' غیاث احمد گدی کے افسانوی مجموعے کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ مجموعے میں شامل تمام افسانوں کا فرداً فرداً جائزہ لینے کے بعد مصنف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ'' گدی کے افسانوں میں انسانی ہمدردی کے جذبات شدت سے سامنے آتے ہیں جو خاص طور پر پسماندہ و محروم طبقات نیز عورتوں کی نفسیات سے قریب تر اور ہم آہنگ ہیں۔ گدی معمولی اور غیر اہم واقعہ کو بھی اپنے خاص انداز و اسلوب اور غیر معمولی تخلیقی جودت طبع سے غیر معمولی اور اہم بنادینے کا ہنر رکھتے ہیں۔''

''جدید تر ادبی نسل، رجحانات و مسائل''، ''اردو کی صورت حال چند باتیں''، ''قلم کار اور مدیر: رشتہ و روابط''، ''ادب کی تعلیمی معنویت: ماہرین تعلیم کی نظر میں'' ایسے مضامین ہیں جن کے مطالعے سے غور وفکر کی نئی راہیں نکلتی ہیں۔ مضمون'' کمیونزم سے اندھی عقیدت کا مسئلہ'' بھی ازم سے ہٹ کر حقیقت پر مبنی صورت حال کی تفہیم کی دعوت ہے۔

''بابا شیخ فرید''، ''اقلیتوں کے تعلیمی حقوق اور مسائل''، ''آشر یاد آتے ہیں''، ''صلاح الدین پرویز کا آئیڈینٹٹی کارڈ''، ''افکار گریزاں''، ''سیارہ لاہور کا سالنامہ''، ''چنڈی داس اور رامی'' تبصرے ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔ یہ تبصرے توجہ سے کیے گئے ہیں اور نہایت غیر جانب دارانہ ہیں۔ تبصرہ نگار کی نگاہ خوب و زشت ہر دو جانب اٹھی ہے۔ کتاب کے آخر میں ناوک حمزہ پوری کی دو کتابوں پر تحریر کیے مقدمے یا پیش لفظ اور بیتاب کیفی کے مجموعے'' دھوپ میں بارش'' کا پیش لفظ بھی شامل ہے۔ ان کے مطالعے سے فن کار اور فن دونوں سے روشناس ہونے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ عطا عابدی کی تحریروں میں سلاست بھی ہے اور شگفتگی بھی۔ وہ بے باک اور بے خوف ہوکر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں ان کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر ان کی نیت پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی تحریریں وسیع النظری اور وسیع الخیالی کی حامل ہیں۔

کمپوزنگ طباعت اور کاغذ کا معیار اوسط ہے۔ سرورق سادہ مگر پرکشش ہے۔ کتاب کی قیمت کچھ زیادہ ہے۔

□□□

مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

مصنف: وہاب قیصر

''مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت'' میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا آزاد کی سوانح، تحریریں، صحافت اور وزارت میں جہاں کہیں بھی سائنسی مزاج، سائنسی اصول اور سائنسی برتاؤ نظر آئے انھیں ضبط تحریر کیا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں موصوف نے مولانا کے لیے سائنس کی تعلیم کا حصول، مولانا آزاد کا سائنسی شعور، غبار خاطر سائنس کے تناظر میں، البیرونی اور جغرافیۂ عالم اور مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپئے

تاریخ تعلیم ہند

مصنف: سیّد نوراللہ/ جے. پی. نائک، مترجم: مسعودالحق

اس کتاب میں 1765 سے 1947 تک ہندوستان میں عہد بہ عہد ہونے والی تعلیمی تبدیلیوں کا مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جدید تعلیمی تاریخ کی ہر اہم منزل پر ایک مکمل اور جامع تبصرہ کرنے، ہر اہم فیصلے کے پیچھے کارفرما اسباب اور ان کے اثرات کو سمجھانے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کس طرح وجود میں آیا ساتھ ہی یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیمی اقدام صرف حال ہی کے سمجھنے میں معاون نہ ہو بلکہ مستقبل کی اصلاحات اور تنظیم نو کے رخ کی بھی نشان دہی کرے۔

صفحات: 552، قیمت: -/111 روپئے

خسرو متین

نادان مرغا

کسی جنگل میں ایک خوبصورت نوجوان مرغا رہتا تھا۔ روز سویرے اٹھنا اور اذان دینا اس کا معمول تھا۔ ایک دن وہ حسب معمول اذان دے رہا تھا۔ قریب میں ایک درخت کی ٹہنی پر ایک کوّا بیٹھا اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کوّے کو شرارت سوجھی اور اس نے مرغے کی تعریف کرنا شروع کردی۔

''مرغے بھائی! جانتے ہو تمھاری یہ اذان کتنے کام کی ہے۔ تمھاری آواز سن کر ہی سورج جاگتا ہے۔ اگر تم اذان نہ دو تو یہ سورج نہیں جاگے گا۔ چاروں طرف اجالا نہیں پھیلے گا۔ دنیا کی گہما گہمی ختم ہوجائے گی۔''

نوجوان مرغا پہلے بھی اذان دے کر خوش ہوتا تھا مگر کوّے کی زبان اپنی تعریف سن کر اسے خوشی کی بجائے غرور نے آگھیرا۔ اس نے سوچا میں کتنا عظیم ہوں۔ لوگ میری عظمت کو نہیں پہچانتے۔ وہ دوڑا دوڑا ایک بزرگ مرغے کے پاس گیا اور غرور سے گردن اکڑا کر وہ تمام باتیں جو کوّے نے کہی تھیں اسے سنائیں۔ بزرگ اور جہاں دیدہ مرغے نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کی باتوں پر صرف مسکرا دیا۔ نوجوان مرغے کو اس کی یہ خاموشی اچھی نہیں لگی۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ میری عظمت سے جل گیا ہے۔ وہ دوڑا دوڑا لومڑی کے پاس گیا اور تمام واقعہ اسے سنایا۔ لومڑی نے نوجوان مرغے کی تمام باتیں بڑی خاموشی سے سنیں اور اس کی کم عقلی اور مغرور انداز پر صرف مسکرا دی۔

نوجوان مرغا ایک ایک کر کے گلہری، طوطے، ہرن اور دیگر جانوروں سے ملا۔ سبھی نے اس کی نادانی اور کم عقلی پر ترس کھایا اور چپ رہے۔ کچھ نے اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی مگر ان کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

اس رات نوجوان مرغے کو نیند نہیں آئی۔ وہ رات بھر پہلو بدلتا رہا۔ بے چینی حد سے بڑھی تو اذان دینے لگا۔ نوجوان مرغے کے اذان دینے کے بعد ہی چڑیاں چہچہانے لگیں اور سورج طلوع ہوگیا۔ ہر طرف اجالا پھیل گیا اور سارے جنگل میں زندگی لوٹ آئی۔ اب مرغے کو اس بات کا پختہ یقین ہوگیا کہ زندگی کی ساری خوشیاں اور رنگینیاں اس کی اذان ہی کی وجہ سے ہیں۔ بزرگ مرغا اور دوسرے جانور اس کی اس صلاحیت سے جلتے ہیں۔

نوجوان مرغا غرور سے اکڑتا ہوا بزرگ مرغے کے پاس پہنچا اور کلغی اونچی کر کے اپنی عظمت کے گیت گانے لگا۔ اس نے بزرگ مرغے کو سخت سست بھی کہا کہ وہ اس کی صلاحیت اور عظمت سے جلتا ہے اور اس کا اعتراف کرنے میں اپنی توہین سمجھتا ہے۔

بوڑھا مرغا ابھی تک اسے بچہ اور نادان سمجھ کر نظرانداز کر رہا تھا مگر جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو اس نے سوچا کہ اب اس کو سبق سکھانا بے حد ضروری ہے ورنہ یہ غلط راہ پر چلتا جائے گا اور یہ غرور اور تکبّر اسے لے ڈوبے گا۔

بوڑھا مرغا چند لمحے خاموش کھڑا رہا اور پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا نوجوان مرغے کے پاس پہنچا اور اچانک اس پر حملہ کر دیا۔ وہ اس غیر متوقع حملے سے گھبرا گیا۔ جب تک وہ اپنا دفاع کرتا تب تک اسے بوڑھے مرغے نے کافی زخمی کر دیا۔ مجبوراً نوجوان مرغے کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔

نوجوان مرغا رات بھر درد سے کراہتا رہا۔ درد کی شدت کے باعث اسے ایک پل بھی نیند نہیں آئی۔ صبح ہونے والی تھی مگر اس میں اذان دینے کی ہمت نہیں تھی۔ اس وقت اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کے اذان دیے بغیر ہی چڑیاں چہچہانے لگی ہیں، سورج طلوع ہو گیا ہے اور چاروں طرف اجالا پھیل گیا ہے۔ زندگی روز کی طرح رواں دواں ہو گئی ہے۔

نوجوان مرغے کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا کوے کی شرارت کو سچ مان کر میں نے غلطی کی ہے۔ وہ مجھے غرور اور تکبر کی راہ پر لگانا چاہتا تھا۔ اس نے کان پکڑ کر اللہ سے توبہ کی۔ اس کے بعد اسے کسی نے اکڑتے اور گھمنڈ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ □□□

پتہ:

K-52, Batla House, Okhla, New Delhi-25

فانی بدایونی (جدید ایڈیشن)

مصنف: مغنی تبسم

اردو غزل کے احیائے جدید میں فانی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اس کتاب میں فانی کی حیات، شخصیت اور شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے فانی کے ناقدین و محققین، عزیز و اقارب، احباب اور جاننے والوں سے شخصی رابطہ پیدا کر کے ان سے متعلق اہم معلومات یکجا کر دی ہے اور شاعر کے فن کے تجزیے کے لیے لسانیات کی اہم شاخ ''اسلوبیات'' کے ذریعے کلام فانی کے صوتی آہنگ کا دلچسپ مطالعہ کیا ہے جو اردو شعر و ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی باضابطہ کوشش ہے۔

صفحات: 499، قیمت: -/210 روپے

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب و تاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہو سکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالات زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت: -/258 روپے

لیان اوفلا ہرٹی

پہلی پرواز

ننھا، جنقلہ اپنی چٹانوں کی کگر پر تنہا تھا۔ اس کے دونوں بھائی اور اس کی بہن پہلے ہی پرواز کر چکے تھے، لیکن وہ اڑنے سے اتنا ڈرتا تھا کہ ان کے ساتھ جا نہ سکا تھا۔ کسی نہ کسی طرح جب اس نے کگر کے کنارے تک آ کر اڑنے کے لیے بازو اوپر اٹھائے تھے تو اسے خوف سا محسوس ہوا تھا۔ نیچے سمندر... میلوں گہرا سمندر... دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے بازو اسے پار نہ لے جا سکیں گے اور وہ اپنے کگر کی چھوٹی سی دراڑ میں، جس میں وہ راتوں کو سویا کرتا تھا، واپس بھاگ گیا تھا۔ جب اس کے بھائی اور بہن جن کے بازو اس سے بہت چھوٹے تھے، کگر کے کنارے پر آئے تھے اور بازو پھڑ پھڑا کر اڑ گئے تھے، تب بھی وہ ہمت نہ کر سکا تھا۔ اس کے ماں باپ بھی فضا میں چکر لگاتے ہوئے آئے تھے اور تیز آواز میں اس سے اڑنے کو کہا تھا اور آخر میں اسے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر وہ نہیں اڑے گا تو اسے وہیں بھوکا مرنا ہوگا۔ مگر اس پر بھی وہ نہیں اڑ سکا تھا۔

چوبیس گھنٹے ہو گئے تھے لیکن اس کے پاس کوئی نہ آیا تھا۔ کل دن بھر وہ اپنے بھائیوں اور بہن کو اپنے ماں باپ کے ساتھ اڑتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔ وہ ان میں اڑنے کی مہارت پیدا کر رہے تھے۔ مچھلیوں کے لیے لہروں پر جھپٹنا اور غوطہ لگانا سکھا رہے تھے۔ پھر اس نے اپنے بڑے بھائی کو پہلی مچھلی پکڑ کر نگلتے دیکھا تھا۔ اس کے والدین اس کے اوپر چکر لگا کر قیں قیں کر رہے تھے۔ پھر اسی صبح کو سب کے سب اس کو بزدلی کا طعنہ دیتے ہوئے سامنے کی پہاڑی پر پرواز کر گئے تھے۔

سورج اونچا ہوتا جا رہا تھا اور اس کی تیز کرنیں چٹانوں کی کگر پر پڑ رہی تھیں۔ اسے گرمی سی محسوس ہوئی کیونکہ رات اس نے کچھ نہ کھایا تھا۔ کگار کے اس کونے میں اس کی ایک مچھلی کی چھوٹی سی دم ملی تھی اور اب وہاں کھانے کے لیے ایک ریشہ بھی نہ تھا۔ اس نے ایک ایک چپہ تلاش کر ڈالا، یہاں تک کہ تنکوں کا وہ گھونسلا بھی جہاں وہ اور اس کے بھائی بہن پیدا ہوئے تھے۔ اس نے انڈوں کے چھلکے، سوکھے خول بھی کترنے کی کوشش کی مگر یہ تو اپنے آپ ہی کو چبانے کی طرح تھا۔ وہ کگر کے اس سرے سے اس سرے تک بے چینی سے آہستہ آہستہ گھومتا رہا کہ شاید ماں باپ تک پہنچنے کا راستہ بغیر اڑے ہوئے نکل آئے، لیکن ہر طرف کگارا ایک خطرناک ڈھال کی شکل میں ختم ہوتا تھا اور نیچے وہی سمندر۔ اس کے والدین اور اس کے درمیان ایک وسیع بحری خلیج تھی۔ وہ وہاں تک پہنچ تو سکتا تھا، اگر وہ شمال کی طرف چلتا۔ مگر چلتا وہ کیونکر۔ بیچ میں کوئی کگر نہیں تھا۔ رہ گیا اڑنا تو وہ اس کے بس کا تھا ہی نہیں۔

وہ کگر کے کنارے تک آہستہ آہستہ گیا۔ ایک پیر پر کھڑے ہو کر اور دوسرے کو بازوؤں میں چھپا کر اس نے ایک آنکھ بند کی اور پھر دوسری، جیسے کہ وہ سونے والا ہو لیکن اس پر بھی انھوں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے بھائی بہن سامنے کی پہاڑی پر اپنے پروں کو گردن میں چھپائے اونگھ رہے تھے۔ اس کا باپ اپنی چونچ سے پیٹھ کے سفید پروں کو کھجلا رہا تھا۔ صرف اس کی ماں اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ پہاڑی کے قدرے اونچے حصے پر کھڑی تھی۔ اس کا سینہ آگے کو نکلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ مچھلی کے ٹکڑے میں سے، جو پاس ہی پڑا ہوا تھا، تھوڑا سا نوچ کر کھاتی پھر اپنی چونچ کو دونوں طرف سے پتھر پر رگڑتی۔ کھانا دیکھتے ہی وہ پاگل سا ہو گیا۔ اسی طرح نوچ کر کھانا اور پھر چونچ کو رگڑ رگڑ کر تیز کرنا اسے کتنا پسند تھا۔ وہ ہلکی آواز سے غرغرایا۔ اس کی ماں بھی غرغرائی اور اس کی طرف دیکھا۔

''قیں، قیں قیں'' وہ چلایا۔ ماں سے کچھ کھانا دے جانے کی التجا کی۔

''قیں، قاں، قاں'' اس کی ماں نے طنزیہ آواز میں جواب دیا لیکن وہ مانگتا ہی رہا اور بالآخر ایک یا دو منٹ کے بعد خوشی سے چیخ پڑا۔ اس کی ماں مچھلی کا ایک ٹکڑا لے کر اس کی طرف اس پار آ رہی تھی۔ وہ پیر پٹختا مشتاقانہ باہر نکل آیا تھا تاکہ اپنی ماں کے قریب ہو سکے لیکن جب وہ بالکل اس کے سامنے مگر کے برابر آ گئی تو رک گئی۔ اس کے پیر ڈھیلے ہو کر لٹک رہے تھے اور اس کے بازو ساکت تھے۔ اس کی چونچ میں دبے ہوئے مچھلی کے ٹکڑے کو وہ آسانی سے پا سکتا تھا۔ ماں کے اتنے نزدیک آ کر رک جانے پر وہ تعجب سا ہو کر رکا رہا اور پھر بھوک سے بیتاب ہو کر مچھلی پر جھپٹ پڑا۔ ایک زور کی آواز کے ساتھ وہ نیچے خالی جگہ میں گرا۔ اس کی ماں کچھ اونچائی پر چلی گئی تھی۔ جب وہ اس کے نیچے سے گزرا تو اسے ماں کے بازوؤں کی آواز سنائی دی۔ اسے خوفناک سی دہشت محسوس ہوئی۔ اس کا دل ساکت سا ہو گیا اور اس کو کچھ سنائی نہ دیتا تھا لیکن ایسا صرف ایک ہی لمحے تک رہا۔ دوسرے ہی لمحے اس کو اپنے بازو باہر کی طرف پھیلے ہوئے محسوس ہوئے۔ ہوا، اس کے سینے کے پروں کو، اس کے پیٹ کو اور پھر اس کے بازوؤں کو تیزی سے چھوتی ہوئی گزر رہی تھی اور وہ اپنے بازوؤں کے کناروں کو ہوا کو کاٹتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ تیزی سے سر کے بل گر نہیں رہا تھا بلکہ بتدریج نیچے سامنے کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ اب وہ بالکل خوفزدہ نہ تھا۔ البتہ تھوڑی سی گھبراہٹ ضرور محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بازو پھڑ پھڑائے اور اوپر پرواز کر گیا۔ اس نے خوشی سے بھرپور آواز نکالی اور پر پھڑ پھڑا کر کچھ اور اوپر چلا گیا۔

''قیں، قیں، قاں، قاں'' اس کی ماں تیزی سے اس کے پروں کو چھوتی ہوئی چلائی۔ اس کے بازوؤں سے ہوا میں تیز آواز پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے ایک دوسری آواز سے اس کا جواب دیا۔ اس کا باپ بھی ہوا میں اڑ کر اس کے پاس خوشی سے چیختا ہوا آیا۔ اس نے اپنے دونوں بھائیوں اور بہن کو دیکھا کہ وہ اس کے اردگرد پرواز کر رہے تھے۔ تیز چیختے، کبھی نیچے، کبھی اوپر آتے جاتے بازوؤں کو پھڑ پھڑاتے اور فضا میں غوطے لگاتے ہوئے۔

اب وہ بالکل بھول چکا تھا کہ اس سے پہلے وہ اڑ نہ سکتا تھا۔ پھر وہ بھی اسی طرح فضا میں، پانی کی سطح کو چھوتے ہوئے گزر جانے اور تیز چبھتی ہوئی آواز سے چیخنے میں محو ہو گیا۔

اب وہ سمندر کے قریب تھا اور بالکل سیدھا اس کی سطح کے متوازی اڑ رہا تھا۔ اس نے نیچے ایک وسیع سبزی مائل سمندر دیکھا جس پر ننھی ننھی پہاڑیاں سی حرکت کر رہی تھیں، اس نے اپنی گردن ایک طرف گھمائی اور خوشی سے چیخا۔ اس کے والدین، اس کے دونوں بھائی اور بہن اسی سبزفرش پر بیٹھ گئے تھے اور تیز آواز میں چیختے ہوئے اس کو بھی اشارے سے بلا رہے تھے۔ اس نے سبز سبز سمندر پر کھڑے ہونے کے لیے اپنے پیر اس پر رکھ دیے لیکن وہ اس میں ڈوب گئے۔ وہ خوف سے چیخ پڑا اور پھر اپنے بازوؤں کو پھڑ پھڑا کر اوپر اٹھ جانے کی کوشش کی لیکن بھوک اور کمزوری سے وہ تھکا ہوا تھا۔ پھر آج کی عجیب سی مشق نے اسے نڈھال سا کر دیا تھا۔ وہ اوپر نہ اٹھ سکا۔ اس کے پیر سمندر میں ڈوب گئے۔ تب اس کے پیٹ نے پانی کو مس کیا اور وہ ڈوبا نہیں۔ وہ پانی کے اوپر تیر رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف اس کے خاندان والے خوشی سے چیخ رہے تھے۔ اس کی تعریفیں کر رہے تھے اور ان کی چونچیں اسے ایک بڑی سی ''جل کپور'' کے ٹکڑے نذر کر رہی تھیں۔ اس نے پہلی اڑان بھر لی تھی۔ □□□

مترجم کا پتہ:

C/o Dr. Abrar Azmi, Khalispur, Azamgarh-276138 (U.P.)

کتب فروشوں اور ادب کے قارئین کے لیے خوشخبری

قومی اردو کونسل کی مندرجۂ ذیل مطبوعات 75 فیصد کمیشن پر طلب کی جاسکتی ہیں

اپنی ضرورت کی کتابوں کا آرڈر آج ہی بھجوائیں

نمبر شمار	کتاب کا نام	قیمت اصل	قیمت مابعد رعایت 75%
01	آزادی	52.00	13.00
02	آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی	123.00	31.00
03	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	80.00	20.00
04	عہد ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	55.00	14.00
05	علی وردی اور اس کا عہد	86.00	22.00
06	عشری درجہ بندی	167.00	42.00
07	آڈیٹنگ کے بنیادی اصول	331.00	83.00
08	برقی توانائی	94.00	24.00
09	بھارت 2001	250.00	63.00
10	بھارت 2002	250.00	63.00
11	چولا راجگان	209.00	52.00
12	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا: حیات اور کارنامے	69.00	17.00
13	فلسفیانہ تجزیہ: ایک تعارف	120.00	30.00
14	فیودر دستیفسکی	52.00	13.00
15	غرائب الجمل	76.00	19.00
16	گلشن بے خار	128.00	32.00
17	ہمارا قدیم سماج	54.00	14.00
18	ہندوستان کا نظام جمالی (جلد اول، دوم، سوم)	1311.00	328.00
19	ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	33.00	08.00
20	ہندوستان کی قانونی تاریخ (جلد اول، دوم)	262.00	66.00
21	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	52.00	13.00
22	ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	95.00	24.00
23	ہندوستانی معیشت	134.00	34.00
24	ہندوستانی مصوری عہد مغلیہ میں	158.00	40.00
25	ہندوستانی مصوری: ایک خاکہ	130.00	33.00
26	حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	92.00	23.00
27	ابتدائی علم شہریت	47.00	12.00
28	انسانی ارتقا	70.00	18.00
29	انتظامی قانون کے اصول	120.00	30.00

30	جامع انگریزی اردو ڈکشنری (جلد۔6-1)	3400.00	850.00
31	جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (جلد۔4-1 اور 8-6)	1790.00	448.00
32	جنت سنگار	180.00	45.00
33	کلیاتِ پریم چند (جلد 1 تا 24)	4071	1018.00
34	للّو لال جی ایک ادبی سوانح	72.00	18.00
35	لغت ابجد شماری (جلد۔1، حصہ دوم)	472.00	118.00
	لغت ابجد شماری (جلد۔2، حصہ اول و دوم)		
36	مجموعۂ نغز	268.00	67.00
37	مسدود راہیں	126.00	32.00
38	مثنوی بہرام و گل اندام	66.00	17.00
39	مولیئر	57.00	14.00
40	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	92.00	23.00
41	اڑیسہ میں اردو	157.00	39.00
42	پشکن	60.00	15.00
43	قدیم ہندی فلسفہ	82.00	21.00
44	قدیم ہندوستان میں شُودر	82.00	21.00
45	قومی زبان	76.00	19.00
46	قواعد کیٹیلاگ سازی	268.00	67.00
47	صنعتی تنظیم اور انتظام	149.00	37.00
48	سیرِ کہسار	167.00	42.00
49	طبیعیات کے بنیادی تصورات	82.00	21.00
50	تمل ناڈو میں اردو	135.00	34.00
51	تنقید عقل محض	158.00	40.00
52	تاریخ طبعی (جلد۔1)	43.00	11.00
53	تاریخ فلسفہ سیاسیات	97.00	24.00
54	تشریح تصاویر	66.00	17.00
55	توضیحی لسانیات	136.00	34.00
56	تذکرۂ مخطوطات (جلد۔5-1)	431.00	108.00
57	تالستائے	46.00	11.00
58	اصولِ معاشیات	47.00	12.00
59	اتر پردیش کے لوک گیت	120.00	30.00
60	دے نگر کے عہد میں نظامِ حکومت	118.00	30.00
61	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	45.00	11.00
62	وضاحتی کتابیات (جلد 1، 3-22)	2650.00	663.00

63	زراعتی انکشافات	192.00	48.00
64	آسان اردو شارٹ ہینڈ	92.00	23.00
65	عکس اور برعکس	128.00	32.00
66	امریکی ادب کا مختصر جائزہ	52.00	13.00
67	بھارت 2004	250.00	63.00
68	دھوپ چولھا	38.00	10.00
69	اجارہ	131.00	33.00
70	فسانۂ آزاد جلد 1 تا 6	1163.00	291.00
71	ہندوستانی سرزمین اور عوام	30.00	08.00
72	ہندوستان کا صنعتی ارتقا	13.00	03.00
73	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن	188.00	47.00
74	ابتدائی سماجیات	43.00	11.00
75	ارتقائے کائنات انسان و دیگر مضامین	94.00	24.00
76	جدید ابتدائی منطق	57.00	14.00
77	جان کمپنی سے جمہوریہ تک	114.00	29.00
78	کائنات جلیل	80.00	20.00
79	کتب خانہ داری ایک تعارف	108.00	27.00
80	معاشیات کے بنیادی اصول	82.00	21.00
81	مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کا انتظام حکومت	82.00	21.00
82	پیمائش و نقشہ کشی	85.00	21.00
83	قدیم ہندوستان کی تاریخ	114.00	29.00
84	قدیم تامل ناڈو میں عربی و فارسی	98.00	25.00
85	سفرنامہ فرہنگ مسیر طالبی	73.00	18.00
86	شہیدان آزادی (جلد اول و دوم)	213.00	53.00
87	شخصیت کے نظریات	92.00	23.00
88	شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	150.00	38.00
89	سخنوران گجرات	77.00	19.00
90	تاریخ ہندی فلسفہ (جلد اول)	89.00	22.00
91	تاریخ آصفی	58.00	15.00
92	اجرتیں	95.00	24.00
93	جدید ہندوستان کے سماجی و سیاسی افکار	178.00	45.00
94	جنوبی ہند کی تاریخ	114.00	29.00

یہ رعایت 31 مارچ 2008 تک دی جائے گی۔

نوٹ: محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا، کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

این سی. پی. یو. ایل. کی جنرل کونسل کی 14 دسمبر کی میٹنگ میں (دائیں سے) جناب زبیر رضوی، جناب گوہر رضا، این سی. پی. یو. ایل. کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد اور جناب کمال فاروقی

دائیں سے: محترمہ نسیم بھاٹیہ، جناب ایس. موہن، جناب کمل سنگھ، محترمہ رشمی چودھری، جناب کیشو دیسی راجو (جوائنٹ سکریٹری لنگوسٹجز) اور این سی. پی. یو. ایل. کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید

Date of Publication : 24/12/2007

URDU DUNIYA Monthly, January 2008, Vol. 10, Issue: 1
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

"فکر و تحقیق"

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نامعلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے
اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

ائندہ شمارے میں قرۃ العین حیدر اور گیان چند جین پر خصوصی گوشہ شامل ہوگا

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔
ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے
زرسالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار [illegible] منی آرڈر ہی ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک: 8، ونگ: 7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938